معظمہ نقوی کی تصنیف

نوائے نقوی (نشری تخلیقات) تحقیقی مقالہ برائے بی ایس (اُردو)

مقالہ نگار

مہوش نواز

رول نمبر: ۴۲

رجسٹریشن نمبر: DG-URD-19-42

بی ایس اُردو

نگران مقالہ

مسز اُمِ سلمٰی

ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اُردو

گورنمنٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین،

ڈیرہ غازی خان

سیشن: ۲۰۱۹-۲۰۲۳

شعبہ اُردو

گورنمنٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین، ڈیرہ غازی خان

IN THE NAME OF ALLAH, THE MOST GRACIOUS AND THE MOST MERCIFUL

معظمہ نقوی کی تصنیف

مقالہ برائے بی۔ ایس اُردو

از

مہوش نواز

رول نمبر: ۴۲

رجسٹریشن نمبر DG-URD-19-42

یہ تحقیقی مقالہ بی۔ ایس اُردو سیشن: ۲۰۱۹-۲۰۲۳ء کے تقاضوں کی جزوی تکمیل کے لئے
گورنمنٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین ڈیرہ غازی خان میں پیش کیا گیا۔

حلف نامہ

میں مہوش نواز، رول نمبر: ۴۲، رجسٹریشن نمبر DG-URD-19-42، اقرار کرتی ہوں کہ میں نے یہ مقالہ بعنوان: معظمہ نقوی نثری تخلیقات (نوائے نقوی) کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ برائے حصول سند بی۔ ایس اُردو خود لکھا ہے۔ میں نے سرقہ سے کام نہیں لیا اور تحقیق میں اخلاق کے اُصولوں کو مدِ نظر رکھا ہے۔ نیز اس سے پہلے یہ موضوع کسی بھی کالج یا یونیورسٹی میں حصولِ سند پیش نہیں کیا گیا۔ اس مقالہ کے تمام نتائج تحقیق اور جملہ عواقب کی ذمہ دار ہوں۔ غلط بیانی کی صورت میں کالج تادیبی کارروائی کر سکتی ہے۔

مہوش نواز

بی۔ ایس اُردو

تصدیق نامہ

اس امر کی تصدیق کی جاتی ہے کہ بی ایس کی طالبہ مہوش نواز کے تحقیقی مقالہ بعنوان معظمہ نقوی کی تصنیف نوائے نقوی کی نثری تخلیقات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ کا مطالعہ وقت نظر سے کیا ہے۔ میں طالبہ کے تحقیقی کام سے مطمئن ہوں اور اس امر کی سفارش کرتی ہوں اور اجازت دیتی ہوں کہ ان کا یہ مقالہ بی۔ ایس اُردو کی جانچ کے لئے جمع کروادیا جائے۔

اُمِ سلمٰی

ایسوسی ایٹ پروفیسر شُعبہ اُردو

گورنمنٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین،

ڈیرہ غازی خان

انتساب

اپنے پیارے والدین کے نام

"جن کی دُعائیں ہر وقت میرے ساتھ ہیں

جنہوں نے زندگی میں جہد مسلسل کا سبق دیا،

اور اپنی آغوش محبت میں دنیا کے سنگ ریزوں سے بچائے رکھا۔

قابل احترام اساتذہ اور

معظمہ نقوی کے نام جن کی علم دوستی اور تعاون نے مجھے اس مقام پر پہنچایا"

اظہارِ تشکر

میں شکر گزار ہوں اس عظیم ذات کی جس نے یہ کائنات تخلیق کی اور انسان کو عقل و علم کی دولت سے نواز کر اسے اشرف المخلوق کا درجہ دیا۔

میں شکر گزار ہوں اپنے والدین کی جن کی وجہ سے یہ دُنیا مجھے جنت نظر آتی ہے، جن کے خلوص، دُعائیں اور نیک تمنائیں میری راہ میں حائل ہونے والی ہر مشکل گھڑی کو دور کرتی گئیں، اور میرے لئے آسانیاں پیدا ہوتی گئیں۔ جنہوں نے میری بھرپور حوصلہ افزائی کی اور ہر لمحے میری ہمت بڑھائی اور میرا سائے کی طرح ساتھ دیا اور کبھی مجھے بکھرنے نہیں دیا۔

میں شکر گزار ہوں اپنی نگران مقالہ محترمہ اُمِ سلمٰی کی جنہوں نے موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالہ کی تکمیل تک ہر مرحلہ بھرپور تعاون کیا۔ آپ نے کام کی نوک پلک سنوارنے میں اپنے بچوں کی طرح انگلی پکڑ کر چلایا۔ جب بھی اس تحقیقی مقالے میں مشکلات آئیں آپ رہبر اور راہنما نظر آئیں۔ آپ کی باتوں نے میرے علمی فکر کو قوت بخشی اور میں نے ان سے علم کے نادر و نایاب موتی چنے۔ ہر غلطی کو تاہی کو نظر انداز کرنے سے ایک خلیق اُستاد بن کر سمجھایا۔ انہی کے خصوصی تعاون اور ایثار سے یہ تخلیقی مقالہ اپنے انجام خیر کو پہنچا۔

میں شکر گزار ہوں کہ آکر میں اس ہستی کی جس نے اس تحقیق میں میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا جن کے ہاتھ میرے لئے دُعا کی طرح بلند ہوئے۔ بے شمار چاہنے والوں کی جو میرے لئے مصروف دُعا رہے۔ جب بھی میں کام میں مصروف رہی خاص کر محترمہ معظمہ نقوی صاحبہ کی جس نے میری ہر گھڑی اس طول تحقیقی مقالے میں مدد کی اور انہوں نے تحقیقی مقالے میں میرا حوصلہ کمزور نہیں ہونے دیا۔ بلکہ بے حد ہمت بڑھائی۔ اور قدم قدم پر رہنمائی کرتے ہوئے میرے اس مقالے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں معاون رہیں۔

پروردگار کے حضور دُعا گو ہوں کہ وہ میرے اس کام کو میرے لئے توشہ آخرت بنائے اگر اس میں کوئی خوبی ہے تو مہربان مالک کی عطا کی ہے تاہم غلطیوں یا کوتاہیوں کا بوجھ میرے کاندھوں پر ہوتا۔ آپ کا تعاون، حوصلہ افزائی اور راہنمائی کی قدر کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تیاری آخرت میں نیک اور کامیاب بنائے اور سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

مہوش نواز

رجسٹریشن نمبر DG-URD-19-42

گورنمنٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین، ڈیرہ غازی خان

فہرست ابواب

باب اول:	معظمہ نقوی کا تعارف اور تصانیف	1-13
باب دوم:	تحقیقی مضامین	12-18
باب سوم:	ادبی کالم	19-86
باب چہارم:	تبصرہ جات کتب	87-10

باب اول

معظمہ نقوی کا تعارف اور تصانیف

معظمہ نقوی کا تعارف اور تصانیف:

معظمہ نقوی بنیادی طور پر ایک شائستہ، باوقار اور منکر المزاج خاتون ہیں۔ ان پر شروع سے ہی شہرت کی دیوی دلدادہ ہے۔ ان کا نام اور منفرد کام ان کے ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

وہ خانوادہ سادات کی ایک خوبصورت کلی ہیں، یہی وجہ ہے کہ مذہب اور اسلام کی جانب ان کا رُجحان زیادہ ہے۔ ان کا شمار عہد حاضر کی قابل فخر خواتین لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک عرصہ سے علم و ادب کی خدمت کر رہی ہیں۔ انہیں نظم اور نثر دونوں میں نمایاں مقام حاصل ہے، اور وہ وطن عزیز پاکستان کے نسائی ادب میں ایک خوبصورت افسانہ ہیں۔(۱)

معظمہ نقوی پنجاب کی سرزمین شہر ڈیرہ غازی خان میں ۱۲ جولائی ۱۹۹۰ء میں پیدا ہوئی ہیں۔ جو کہ علم و ادب کے حوالہ سے ہمیشہ زرخیز ثابت ہوئی ہے۔ بات اگر اُردو ادب کے حوالے سے کی جائے تو شفقت کاظمی کیف انصاری، محسن نقوی، عقیل نقوی ڈیرہ غازی خان کی بھی علمی و ادبی میدان میں ہمیشہ مردوں کے شانہ بشانہ رہیں ہیں۔(۲)

پروفیسر شیریں عنبر لغاری، پروفیسر صابرہ شاہین، ڈاکٹر شاہینہ اور محترمہ ایمان قیصرانی صاحبہ کسی بھی تعارف کی محتاج نہیں ہیں، مگر میں آج ڈیرہ غازی خان کی جس شاعرہ کا تعارف کرانا چاہتی ہوں وہ اُردو کے مشہور شاعر شفقت کاظمی کے گھرانے میں پیدا ہونے والی معظمہ بتول ہے اور قلمی نام معظمہ نقوی ہے۔(۳)

ان کا تعلق سرزمین ڈیرہ غازی خان سے ہے۔ ان کے والد محترم کا نام سید کفایت حسین ہے۔ ان کا گھرانہ سادگی، شرافت، عزت، محنت، جدوجہد کی وجہ سے اپنے خاندان میں ممتاز ہیں۔ ان کے والد نماز، روزے کے پابند اور ایک نیک انسان ہیں۔ وہ محنت مشقت پر یقین رکھتے ہیں ان کا رُعب و دبدبہ ہے۔(۴)

انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم یعنی پرائمری کی تعلیم ایم سی گرلز سکول نمبر 1 سے حاصل کی، میٹرک کی تعلیم مُلا قائد شاہ سکول سے حاصل کی۔ پھر گورنمنٹ ڈگری کالج میں گریجویشن کیا اور وہیں سے ہی کمپیوٹر سائنس میں اور فارلائبریرین شپ میں ڈپلومہ کیا۔ اور ایم۔ اے اُردو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی لاہور سے کیا۔(۵)

ان کو بچپن میں کھیلنے کودنے کا شوق نہیں تھا، بلکہ شروع ہی سے پڑھائی کی طرف خاصہ رُجحان قائم رہا۔ مختلف مضامین کا مطالعہ کرتی تھیں۔ اُن کو شروع سے ہی ڈائری اور پین کا شوق تھا اور وہ نئے نئے پین مختلف ڈیزائن کی ڈائری خریدنے کی شوقین تھیں۔

تحفہ میں بھی وہ نئے ڈیزائن کے پین لیتی تھی اور اُن کو لے کر بہت خوش ہوتی تھیں۔ یہ ان کے مشاغل میں شامل ہوتی تھیں۔(۶)

کھوگئے وہ سارے معصوم لمحے بے مطلب سی چاہتیں
سچے سارے جذبے، کہاں گئے میرے بچپن کے وہ بے مول لمحے (۷)

اُن کا رجحان بچپن سے ہی نظم کی طرف تھا، انھیں نہ صرف دُنیاوی تعلیم بلکہ دینی تعلیم سے بھی خاص لگاؤ ہے۔ ان کے گھر کا ماحول دینی ہونے کی وجہ سے قرآن کی تعلیم پر زیادہ توجہ دیتی تھی۔ اسی وجہ سے اُن کا رُجحان دینی حوالے سے سلام و منقبت کی طرف زیادہ ہے۔(۸)

معظمہ نقوی نے دو قسم کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کا شرف حاصل کیا۔ ایک مدرسے کی تعلیم دوسرا اسکول کے اساتذہ دونوں ہی قسم کے اساتذہ نہایت مہربان اور شفیق اور قابل ملے جو محنت کرنے اور طلبہ سے محنت کروانے والے تھے۔(۹)

قرآن پاک کی تعلیم اُن کی والدہ محترمہ نے دی اور دُنیاوی تعلیم کے لئے وہ نمبر ا سکول کے نہایت قابل اساتذہ سے پرائمری کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کو بچپن ہی سے رائٹنگ پریکٹس کرائی گئی جو سکول میں عمومی تختیوں پر بچوں کو کروائی جاتی ہے۔ اس لئے خطاطی یا خوش نویسی تو نہیں مگر صاف لکھ لیتی تھیں۔(۱۰)

پرائمری میں ان کی کلاس انچارج مس حمیدہ تھیں جو کہ ایک محنتی، ماہر اور مخلص استانی تھیں۔ جنہوں نے کبھی سختی اور کبھی نرمی سے پوری کلاس سے محنت کروائی۔ ان دنوں تختی لکھنے پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ جس سے خوش خطی کا اہتمام ہوتا تھا۔

وہ شروع ہی سے محنت کی عادی رہی ہیں۔ سکول سے لے کر کالج لائف تک اور اس سے آگے بھی وہ محنت کرتی آئی تھیں۔ آج تک وہ اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹیں۔ گورنمنٹ ڈگری کالج سے انہوں نے گریجویشن کیا اور ماسٹر کی ڈگری انہوں نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے کیا۔ ماسٹر اُردو میں ہی کیا تھا اس سے خاص پتا چل رہا ہے کہ اُردو ادب سے اُن کا رُجحان زیادہ ہے۔ معظمہ نقوی نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ اسٹیٹ لائف انشورنس پالیسی میں بھی ملازمت کی تھی لیکن زیادہ اس کے ساتھ زیادہ دیر نہیں چل سکیں۔ مطلب کہ اس کو اپنا شعبہ نہیں بنا سکیں۔

معظمہ نقوی جیسی ادیبوں کا بچپن اکثر و بیشتر دوسرے بچوں سے ہٹ کر ہی ہوتا ہے۔ ان جیسی ذہین ادیبوں کو اکثر بچپن ہی میں ادب سے لگاؤ ہو جاتا ہے۔ معظمہ نقوی کو بھی بچپن سے نظمیں پڑھنے کا شوق تھا۔ جو ان کی ادب سے لگاؤ کی ابتداء ثابت ہوا۔ اسی کے ساتھ ہی اُن کو اُردو ڈائجسٹ پڑھنے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ لیکن گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود آپ اپنی نصابی کتابوں میں کہانیاں رکھ کر پڑھا کرتی تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ امتحان کے دنوں میں بھی وہ ڈائجسٹ پڑھتی تھیں اور وہ ڈائجسٹ اپنی سہیلیوں سے لے کر آتی تھیں پھر اُن کو مکمل پڑھ کر واپس دے آتی تھیں۔

معظمہ نقوی ایک انٹری ویو دیتے ہوئے بتاتی ہیں: میں کیوں لکھتی ہوں۔۔۔۔؟

میں نے جب سے لکھنا سیکھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا

"کلام صرف زبان و بیان کا نام نہیں ہے بلکہ قلم کے ذریعے اپنی فکر کو آشکار کرنا ولیوں کا شیوہ رہا ہے۔ لکھنا کوئی فن نہیں، یہ عطیہ خداوندی ہے۔ یہ ہنر اگر آسان ہوتا تو دُنیا کا ہر شخص ہی ماہر قلمکار ہوتا۔ جب میری حقیرانہ ہستی، نا سمجھی سے شعور کی دنیا میں داخل ہوئی، تو اپنی کچھ ناتواں سی آرزوں، اپنی محسوسات کو ڈائری پر رقم کرنا میری عادت بن گئی۔ پھر اس ڈائری کو کوئی پڑھ نہ لے۔ اسے کپڑوں میں چھپا چھپا کر رکھتی اور جب کبھی وہ ڈائری امی، ابو کے ہاتھ لگ جاتی تو میں غصے میں آکر اس کو نذرِ آتش کر دیتی۔ یوں ہر سال میں کئی ڈائریاں لیتی، لکھی اور ان کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی۔ میں نے دیگر لڑکیوں کی طرح کبھی مہنگے کپڑوں، جیولری، دولت بنانا، ہنگامہ، گھومنا پھرنا ان سب کے نہ خواب دیکھے اور نہ کوئی شوق پالا۔ میں ہمیشہ پین (قلم) لینے، ڈائری لینے کا خواب دیکھتی۔ اپنا زیادہ تر وقت تنہا گزارتی جس پر ابو جی سے خاص طور پر ڈانٹ ملتی۔۔۔۔ اور کہتے ۔۔۔ آدم بیزار مت بنو۔۔۔۔ اپنی محسوسات کو لفظوں کے ذریعے کاغذ پر ہی رقم کرتی۔ جب کبھی میری کسی سینئر کو میرے جنون کا علم ہوتا تو وہ یہی کہتی۔ ہاں وقتی شوق ہوتے ہیں یہ ڈائری کے بھی تم بھی بھول جاؤ گی۔ یہ سب۔۔۔۔ اُن کے یہ الفاظ مجھے تیر بن کے گننے اور کئی کئی دن میں اسی کرب میں رہتی اور دُعا کرتی۔ یا اللہ مجھے کاغذ قلم سے بے پناہ عقیدت ہے خدایا مجھ سے یہ سب کبھی مت چھیننا یہ میری قوت گویائی ہے۔ پھر زندگی کے تلخ لمحے بھی آئے وقت کے بے رحم ہاتھوں کی چپیڑیں جب میری روح کے رُخساروں پہ پڑیں تو میں نے اپنے درد کو لفظوں کی زبان دینا شروع کی، ناجانے کب اور کس وقت میرے لکھے نے مجھے باادب بننے کی لائن میں کھڑا کر دیا۔ آج میں صرف اس سوچ سے لکھ رہی ہوں کہ خود اس کو اس اہل بنالوں کہ ادب کے سمندر میں اک قطرہ بن کر ضم ہو جاؤں۔ بس یہی ایک خواہش اب بے حساب ہے۔" (۱۱)

معظمہ نقوی کو نہ صرف ڈائری لکھنے کا شوق اور ڈائجسٹ پڑھنے سے دلچسپی تھی بلکہ لکھنے کی بھی بھرپور شوقین رہیں۔ معظمہ نقوی شاعرہ اور مصنفہ ہیں جن کی تین کتب شائع ہو چکی ہیں۔ جائے پیدائش ڈیرہ غازی خان ہے۔ بطور شاعرہ اُنھوں نے اپنی جداگانہ شناخت بنائی ہے۔ اندرون اور بیرون ملک کے اخبارات اور جرائد میں ان کی تخلیقات اور کالم شائع ہوتے ہیں۔ قلمی سفر میں بچپن ہی سے عقیدت رہی اور لکھنے کا سفر بھی جاری رہا۔ (۱۲)

۲۰۱۸ء میں حلقہ ارباب ذوق ڈی جی خان کی ویکیپیڈیا پہ ہسٹری میں میں نامور شخصیات کی فہرست میں ان کا نام بطور شاعرہ شامل ہوئی ہیں۔

نثری صنف میں افسانہ نگاری میں طبع آزمائی کرتی ہیں۔ ادبی رسائل و اخبارات سے بطور ادبی رکن کے منسلک ہیں۔ پہلا اُردو افسانہ "پہلی محبت" قوس علمی و ادبی رسالہ (گورنمنٹ ڈگری کالج خواتین کوٹ چھٹہ)، ڈیرہ غازی خان سے شائع ہوا۔ (۱۳)

نوائے نقوی کے عنوان سے کالم کا سفر جاری ہے۔ جن میں مصنوعی محبت، سستی شہرت، ادب کی خستہ حالی، عاشور کا دن گر نہ ہوتا، کرونائی دور اور ادب و دیگر شامل ہیں۔

ان کے کالم تحریر اور کتابوں پر تبصرے آئے روز پڑھنے کو ملتے ہیں۔ کسی نہ کسی ادیب کی کتاب پر ان کا تبصرہ لازم پڑھنے کو ملتا ہے۔ ان کی ہر تحریر جاندار اور دلکش ہوتی ہے۔ الفاظ کا چناؤ اور تسلسل اس قدر خوبصورت انداز میں ہوتا ہے کہ قلم کی تاثیر پڑھنے پر اپنے اثرات لازم چھوڑتی ہے۔ ادب سے وابستگی اور والہانہ عشق کا ثبوت انتخاب سے ان کی ایک کتاب "کف دست" کے نام سے ۲۰۱۹ء اشاعت ہوئی اور دوسری کتاب "سلام منقبت" کے نام ۲۰۲۱ء میں منظر عام پر آئی۔(۱۴)

اُن کی تیسری کتاب نوائے نقوی جو کہ اُن کی نثری تخلیقات ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معظمہ کی نثر پر ماہرانہ گرفت کا پتا چلتا ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی شاعرہ نثر پر بھی مہارت رکھتی ہو۔ تاہم معظمہ نقوی نظم اور نثر دونوں میں یکساں مہارت رکھتی ہیں۔(۱۵)

بقول سید مبارک علی شمسی:

"معظمہ نقوی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ ان پر شروع سے ہی شہرت کی دیوی فریضہ ہے"۔ ان کا نام اور اُن کا منفرد کام ہی ان کے ہونے کی گواہی دیتا ہے"۔(۱۶)

معظمہ نقوی مادیت پرستی کے شکار معاشرہ کو حقارت کے سپرد کر کے اسلامی اُصولوں پر زندگی گزارنے اور حرص و لالچ سے پاک و پاکیزہ تعلقات بنانا پسند فرماتی ہیں۔ ان کا شمار عہد حاضر کی مایہ ناز خواتین لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک عرصہ سے علم و ادب کی بھرپور خدمت کر رہی ہیں۔ اُنھیں نظم و نثر دونوں میں نمایاں مقام حاصل ہے، اور وہ وطن عزیز پاکستان کے نسائی ادب میں اک خوبصورت افسانہ ہیں۔ انھیں قومی زبان اُردو سمیت ماں بولی سرائی کی میں بھی سخن وری کا ملکہ حاصل ہے۔(۱۷)

نظم پیلی رُت

اکھیں وچ رُک گئے مونجھ دا موسم!
ٹلدا نئیں اے ڈکھ دا موسم!
ٹلسی کڈاں کیہڑتے پیلی رُت دا موسم!
رات کالی کوں پئی ہیر چجلا وے
ہکلاں مارے ماہی ماہی سڈ
وچھوڑے دے ہن روگ وڈے پوہ مہینے ڈتے ہن نقو بھوگ وڈے!! (۱۸)

وہ اپنی تحریروں میں معاشرتی بگاڑ اور معاشرتی ناہمواریوں سمیت علاقائی مسائل کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ صنف نازک کو درپیش چیلنجز اور ان کی محرومیوں اور مجبوریوں کو بھی اپنا ذریعہ اظہار بناتی ہیں۔ معظمہ نقوی مضامین، کالم اور افسانے پر کام کر رہی ہیں۔ اُن کی اُردو سرائیکی شاعری کی کتب پہ بھی کام جاری ہے۔ (۱۹)

ڈاکٹر خان محمد ساجد کے بقول:

محترمہ نے جن مضامین پر قلم اُٹھایا ہے، اُن میں اُردو تنقید، اُردو زبان کی تاریخ، نثر کا ارتقائی جائزہ، سر سید احمد خان کا حسب نصب نسب، تصوف، حقیقی اور مصنوعی محبت، قتل عمد، یوم عاشورہ، ادب کے مسائل، کرونائی دور کا ادب کچھ کتابوں کے تبصرے اور کچھ شخصیات پر تحقیقی مضامین بھی شامل ہیں۔

اُردو زبان کی تاریخ کا موضوع خاصہ دلچسپ ہے اور معظمہ نے بھی اس پر کسی حد تک روشنی ڈالی ہے۔ اُنہوں نے بالکل صحیح فرمایا کہ زبان کا تعلق تاریخ کے تغیر و تبدل اور ارتقاء سے بہت گہرا ہے۔ بیرونی حملہ آوروں نے ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں پر بہت گہرا اثر اڈالا۔ (۲۰)

اُردو نثر کے ارتقائی جائزے کے حوالے سے بھی معظمہ نے بہت پُر مغز مقالہ تحریر کیا ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو نثر میں ابتداء میں مذہب اور تصوف غالب تھا، اور وہ بھی تمثیلی قصوں کی شکل میں۔ لیکن فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا کردار اُردو کی ترقی میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہاں ابتدائی نصابی کتابیں اور ناول تخلیق ہوئے۔

اس سلسلے میں مصنفہ نے مستشرقین اُردو کو اینگلو ہرڈینیل لینگویج کہتے ہیں۔ انگریزی الفاظ کو اپنے اندر سمونے کی اُردو میں حیرت انگیز صلاحیت تھی۔

زبان کے ارتقاء کے حوالے سے معظمہ کی تحقیق بھی اعلیٰ ہے۔ اس حوالے سے میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گی کہ اُردو پر مقامی زبانوں کے اثرات پر مناسب انداز میں توجہ نہیں دی گئی حالانکہ اُردو کا خمیر اُنھی زبانوں سے اُٹھا کر دیا ہے۔ (۲۱)

معظمہ نقوی نے نہ صرف تنقید نگاری کی بلکہ شعر و شاعری ہی سے انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا انہوں نے نثر اور شاعری دونوں اصناف ادب میں طبع آزمائی کی۔ ان کی تین تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تصانیف کی فہرست درج ذیل ہیں۔

زیر طباعت:

آخری بارش (نظموں کا مجموعہ)

اور سرائیکی شعری مجموعہ

غیر مطبوعہ:

تبصرہ جات (نوائے نقوی جلد دوم)

افسانوی مجموعہ

دوایم۔فل مقالہ جات (۲۲)

فرزانہ سحاب مرزا کے بقول:

"معظمہ نقوی کی "نوائے نقوی" کا مسودہ میری پیش نظر ہے۔ جس میں تحقیقی، تنقیدی اور ادبی مضامین اور کالمز شامل ہیں۔ جو مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہو کر داد وصول کر چکے ہیں۔

اس کی کتاب کے مطالعے سے معظمہ کی نثر پر ماہرانہ گرفت کا پتا چلتا ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی شاعرہ نثر پر بھی مہارت رکھتی ہو۔ تاہم معظمہ نقوی نثر اور نظم دونوں میں یکساں مہارت رکھتی ہیں۔

نوائے نقوی میں انہوں نے مختلف موضوعات و شخصیات اور کتب کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا ہے۔ جس میں وہ بہت حد تک کامیاب رہی ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں ادبی کالموں کو بھی جگہ دی ہے۔ ان کے جو کالم نیم ادبی ہیں ان میں ادبی رنگ جھلکتا ہے۔ ان کے تحقیقی مضامین میں معیار ادب پر پورا اُترتے ہیں۔

اپنی اس کتاب سے وہ نثر نگاروں میں شامل ہو گئی ہیں۔ ان کا متحرک ذہن انہیں خاموش نہیں بیٹھنے دیتا اور وہ کچھ نہ کچھ لکھنے میں مگن رہتی ہیں۔ میں اس کاوش پر انہیں خراج تحسین پیش کرتی ہوں۔ (۲۳)

پروفیسر ڈاکٹر سید ضمیر بخاری معظمہ نقوی کی نثر ایک جائزے میں لکھتے ہیں:

"معظمہ نقوی خانوادہ سادات کے علمی گھرانے کی چشم و چراغ ہیں"۔ قلم سے اس گھرانے کا رشتہ بڑا قدیمی ہے۔ معظمہ نقوی اُردو کے غیر معمولی لکھنے والوں میں سے ہیں۔ پیش نظر کتاب بہ عنوان نوائے نقوی تنقیدی، تجزیاتی اور تاثراتی نگارشات کا ایک حسین گلدستہ ہے۔ اس میں مختلف موضوعات پر الگ الگ عنوانات کے تحت تین ابواب تحقیقی مضامین ادبی کالم، تبصرہ جات کتب شامل ہیں۔

کتاب میں شامل مضامین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان مضامین میں متذکرہ شخصیات کی فکری و فنی حیات کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔ ان مضامین میں مصنفہ نے بہت حد تک موضوعات سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔

"تحقیقی مضامین میں اُردو تنقید کا پس منظر، اُردو زبان تاریخ کے آئینے میں، نثر کا ارتقائی جائزہ اُردو غزل کا ارتقاء بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ تبصرہ نگاری میں انہوں نے ایک کہکشاں ادب سجائی ہے۔ جس میں تنقیدی پہلو قابل تعریف ہے۔ اسلوب نثر میں معظمہ نقوی سادہ سلیس اور رواں نثر کا پیرائیہ اظہار بیان کرتی ہیں۔ ان لوگوں کے برعکس ہیں جو آسان کو بھی مشکل بنا دیتے ہیں زبان و بیان دونوں شگفتہ اور دلکش ہیں۔ عام فہم انداز و اسلوب کی سادگی قاری کو متاثر کرتی ہے۔

تمام مضامین نہ صرف اسلوب قلم بلکہ انداز تنقید و حسن تعارف کا بہترین نمونہ ہیں۔ معظمہ نقوی قابل تہنیت ہیں۔ جو اس کام کو بہ حسن و خوبی نبھانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ نوائے نقوی میں ایک کہکشاں دکھائی دیتی ہے، جو اس خطہ کہ بہت سی نامور ہستیوں کی لفظی تصویر بنانے میں بہت حد تک کامیاب ہوئی ہے۔

تجسیم نگاری میں انہیں ایک خاص دسترس حاصل ہے۔ "نوائے نقوی" کے مضامین تحقیقی، تنقیدی، تجزیاتی و تاثراتی مضامین دنیائے ادب کا ایک جہاں جگمگاتا دکھائی دیتا ہے۔ نوائے نقوی ادبی حلقوں میں ضرور پذیرائی حاصل کرے گی اور ارباب علم و فضل کی نظروں میں اعتبار حاصل کرے گی۔ (۲۴)

معظمہ نقوی کا شمار عہد حاضر کی مایہ ناز خواتین لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک عرصے سے علم و ادب کی خدمت کر رہی ہیں۔ انہیں نظم اور نثر دونوں میں نمایاں مقام حاصل ہے، اور وہ وطن عزیز پاکستان کے نسائی ادب میں ایک خوبصورت افسانہ ہیں۔ انہیں قومی زبان اُردو سمیت ماں بولی سرائیکی میں بھی سخن وری کا ملکہ حاصل ہے۔

مظفر احمد مظفر معظمہ نقوی کی نثر نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

اُردو نثر نگاری Prose Writing میں سب سے پہلے سادہ نویسی کے علمبردار بادشاہ شاہ عالم ثانی کو مانا جاتا ہے۔ جن کی تصنیف عجائب القصص سادہ نویسی میں اُردو نثر کی پہلی کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ آپ نابینا ہونے کے باعث صرف املا کروا کر مدعا نگاری کرتے تھے۔ اس کے بعد میر امن کی کتاب "باغ و بہار" کا بہت شہرہ رہا۔

امام احمد رضا خان صاحب دامت برکاتہم کی ولادت ۱۸۵۶ء میں ہوئی۔ آپ نے ۱۴ برس کی عمر سے نثری میدان میں قدم رکھ دیا تھا۔ اور پہلی تصنیف معبیر الطالب فی شیون ابی طالب مکمل کی۔ اس کے بعد دوسری تصنیف "مرتجی الاجابات لدعا الاموات" تھی۔

یہ دونوں کتب شرمندہ اشاعت نہ ہو سکیں۔ امام احمد رضا خان سینکڑوں میں ہیں اور ہزارہا صفحات پر محیط ہیں۔ اس میں شبہ باقی نہیں ہے کہ اُردو کی جدید علمی نثر کے فروغ کا کام سر سید احمد خان اور امام رضا خان نے ہی کیا، لیکن اس بارے میں ایک کا نام مشہور ہو گیا اور دوسرے کا نام مسودہ رہ گیا۔ (۲۵)

اس سلسلے میں افتخار احمد قادری لکھتے ہیں کہ:

"سر سید احمد خان نے بھی بہت لکھا۔ حالی شبلی، نذیر احمد اور سر سید کے دوسرے رفقاء نے بھی بہت لکھا۔ ان کے ہم عصروں میں منشی میں حسین آزاد بھی ان سے پیچھے نہ رہے بلکہ ان چند مصنفین کی تصانیف بھی امام احمد رضا کی تصانیف کے برابر نہیں ہوتیں۔ اس لئے اگر صفحات کی تعداد کو بھی دیکھا جائے تب بھی امام احمد رضا خان فاضل بریلوی کا نمبر سر سید احمد خان سے اُوپر رہتا ہے۔ (۲۶)

عبدالباری قاسمی ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ:

سرسید نے مغرب کی ایک مشہور اور مقبول صنف Essay سے متاثر ہو کر مضمون نگاری کی بنیاد رکھی۔ سرسید مغرب کے مشہور مصنفین ایڈیسن، ڈرائڈن اور بیکن وغیرہ سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اُنھوں نے ان حضرات کے بہت سے مضامین کو ہی اُردو کا لبادہ اوڑھا کر پیش کیا، اور ان کے اسلوب کو اپناتے ہوئے بہت سے مضامین قلمبند کیے۔

مشہور سکالر غلام مصطفیٰ اشرفی نے کیا خوب کہا تھا، کہ صحافی ہو یا ادیب دونوں اپنا مواد ارد گرد پھیلی ہوئی زندگی سے لیتے ہیں۔ صحافی اس مضمون کو بغیر رنگ آمیزی کے بیان کر دیتا ہے مگر ادیب چونکہ حسن کار ہوتا ہے، ساتھ ہی جمالیاتی منطقوں تک اس کی رسائی ممکن ہوتی ہے۔ اس لئے وہ جمالیاتی پہلوؤں کو بہترین اسلوب کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس حوالے سے چراغ حسن حسرت خود لکھتے ہیں کہ:

"مجھے نثر نگاروں میں ابوالکلام کے سوا کسی کا انداز جچتا نہیں تھا"۔(۲۷)

حسرت کا مولانا ابوالکلام کے حوالے سے یہ شعر بھی ملاحظہ ہو کہ:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظر حسرت میں بھی مزا نہیں رہا

نثر کے لغوی معنی بکھری ہوئی سے کے ہیں جو تحریر منظور نہ ہو بلکہ عام گفتگو کی طرح لکھی جائے اسے نثر کہتے ہیں۔ نثر ایک ایسی اصطلاح ہے جس میں مصنف، ادیب یا لکھاری بغیر کسی موزوں صنعت کے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اُردو ادب کی بنیاد شاعری اور نثر پر ہے۔ ہر نثر میں چار طرح کے اوصاف ہوتے ہیں۔

عالمانہ، عارفانہ، شاعرانہ، منشیانہ معنی کے اعتبار سے نثر کی دو قسمیں ہیں۔(۱) دقیق اور (۲) سلیس؛ پھر ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔

ہمارے معاصرین جہاں بہت سے صاحبانِ کمال نثر نگاری کے میدان میں غیر معمولی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں۔ وہیں ایک معتبر نام افسانہ نگار، کالم نگار، تبصرہ نگاری شاعرہ معظمہ نقوی کا ہے۔(۲۸)

میرے پیش نظر "نوائے نقوی" کی صورت میں آپ کی نثری تخلیقات کا دل پذیر مجموعہ فرودس نظر ہے۔ آپ کی تحاریر میں قدرتی طور پر غیر معمولی سنجیدگی، متانت، سلاست، بلند درجہ فصاحت روانی، سلاست اور سادگی کار فرما ہے۔

آپ کی سادگی مگر قدرے پرکاری سے یوں مضمون کو الفاظ کا جامہ پہناتی ہیں کہ قاری بقدر بادام میں بوجھل پن اور الجھن نہیں محسوس کرتا، مشمولات تصنیف میں، اقبال اور تعلیم، اُردو تنقید کا مختصر پس منظر، اُردو زبان تاریخ کے آئینے میں سرسید احمد خان کہاسید تھے معرفت عشق، اور سستی شہرت خصوصاً درخور تحسین ہیں۔ جس سے آپ کی خداداد نثری صلاحیتوں کا ثبوت ملت اہے۔

تحریر میں برجستگی و شستگی آپ کا خلاصہ ہے۔دوسری طرف مدعانگاری Accuation نے آپ کی تحاریر میں سحر انگیزی کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔یعنی یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ مقصدیت آپ کی تحاریر گھٹیوں میں پیوست ہے۔(۲۹)

انتہزا اور پھکڑپن کی علامات سے آپ کا دور بھی علاقہ نہیں بلکہ رشحات میں غور و فکر اور متانت و سنجیدگی کا عنصر وافر پایا جاتا ہے۔صداقت، اثر آفرینی درد و اثر اور صداقت بھی معظمہ کی تحریروں کا حصہ ہے۔

معظمہ کنایات و استعارات و تشبیہات اور دیگر فنی لوازمات کو بروئے کار لا کر اپنے ماضی الضمیر Conscience کو سچائی کے ساتھ پیش کرتی ہیں اور یہی وصف ان کی اثر آفرینی اور درد انگیزی کی وجہ سے بنتا ہے کہ دل سے بات نکلتی ہے اور دل پر اثر انداز ہی نہیں، بلکہ قلب و نظر کو فریضہ بھی کرتی ہے، ساتھ ہی تعقل پسندی و استدلال Rationalism کو بھی ہاتھ سے ہیں جانے دیتیں۔(۳۰)

معظمہ نقوی نے اپنے معاصرین، مضمون نگاروں ادیبوں اور شعراء کو متاثر کیا ہے۔ تاریخ، فلسفہ، اخلاق، مذہب اور سیرت وغیرہ مختلف مضامین پر متنوع اسلوب اپنا کر مضامین لکھے ہیں۔ جنہیں عوام و خواص میں قبول عام ملا ہے۔

نثر میں موضوع کے ساتھ ساتھ جب اسلوب Procedure or Style بھی کار فرما ہو جاتا ہے، تو اس میں از خود دابیت شامل ہو جاتی ہے۔کیونکہ اسلوب ہی در حقیقت کسی خیال یا موضوع کو ادب کے دائرے میں داخل کرتا ہے۔نثر مواد میں اسلوب ادائے خیالات ہوتا ہے۔جس سے مراد مصنف کے ذہنی ارتقاء رجحان کا قاری کے ذہن میں منتقل ہو جانا ہے۔معظمہ نقوی کی نثری تحریروں میں ان کی کشش فکر اور ان کے بہترین اسلوب کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔اخباری کالم، سوانحی، تاریخی مضامین، تاریخ نگاری، خاکہ نویسی ہو یا مطائبات و فکایات ان سب میں ان کا مخصوص طرز تحریر جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آپ کے قارئین آپ کے دل آویز اسلوب سے حد درجہ متاثر ہیں۔ عظمہ نثر کی ہر صنف میں قدرت رکھتی ہیں۔ آپ کی متاع نثر مختلف النوع موضوعات پر مشتمل ہے۔

الغرض متن و سنجیدہ خالص نثر جس میں قرطاس بھی فخر کرتا ہے، آپ ناز کر سکتی ہیں۔ آپ کے کالم صرف شعور خوب و زشت ہی نہیں بلکہ رہن کی بالیدگی اور طراوت فکر کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔ معظمہ نقوی اپنے گرد و پیش کے ماحول اور مقامی موضوعات کو اپنے کالموں میں منفرد انداز میں بیان کرتی ہیں۔ان کے لوک قلم سے فکر آمیز تحریروں کا ایک گرداں قدر ذخیرہ نکلتا ہے۔ معظمہ کا اگرچہ نثر و شعری سرمایہ زیادہ نہیں پھر بھی جو کچھ حاصل ہوا کمیت میں نہ سہی مگر کیفیت میں بڑا ہمہ گیر اور اثر انگیز ہے۔

تخلیقی انشاپردازی کی ایک خوب حسن تحریر ہے۔ تخلیقی نثر لکھتے ہوئے کچھ ادیب ابہام یا ایہام کا شکار ہو جاتے ہیں جو معیار ابلاغ کو مجروح کرتا ہے۔ لیکن معظمہ کی نگارشات ایسے مصائب سے پاک ہیں۔یہ خوبی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

آپ غیر مبہم سلیس، رواں اور دلکش الفاظ سے مزین نثر ایجاد کرتی ہیں۔ ان کا انداز اگرچہ شاعرانہ اور حکیمانہ ہے، مگر آپ قافیہ پیمائی اور مشکل پسندی سے گریز کرتی ہیں۔ کسی بھی طرح کی خود نمائی یا نرگسیت کا مشاہدہ آپ کا وطیرہ نہیں ہے۔ وہ ہر مقام پر شامل بھی ہیں مگر اس انداز میں کہ کبھی منظر نامے سے الگ بھی نظر آتی ہیں۔ اور کہیں تو خود منظر بھی خود ناظر بھی اور کہیں کہیں خود نظارہ بھی ہیں۔

تحریر کی یہی خوبی قاری کے جذبات میں ہیجان اور ایک طرح کا مدوجزر پیدا کرتی ہے۔ دھیمہ پن اور ادائے شائستگی کا خیال ان کی تحاریر کے ایسے اوصاف ہیں جو انہیں اپنے معاصر انشاء پرداری سے قد آور بناتے ہیں۔ (۳۱)

سید مبارک علی شمسی کے بقول:

معظمہ نقوی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، ان پر شروع سے ہی شہرت کی دیوی فریفتہ ہے۔ ان کا تعلق قادر الکلام شاعر حضرتِ محسن نقویؒ شہید کے شہر ڈیرہ غازی خان سے ہے۔ وہ خانوادہ کی ایک خوبصورت کلی ہیں، یہی وجہ ہے کہ مذہب کی طرف اور اسلام کی جانب ان کا خاصہ رجحان ہے۔ وہ مادیت پرستی کے شکار معاشرہ کو حقارت کے سپرد کر کے اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے اور حرص ولالچ سے پاک وپاکیزہ تعلقات بنانا پسند فرماتی ہیں۔

زیر نظر کتاب "نوائے نقوی" ان کے مضامین وکالمز اور تبصروں پر مشتمل ایک مجموعہ ہے۔ جس میں انہوں نے کینہ مشق شعرائے کرام اور قومی ہیروز سمیت ملکی وبین الاقوامی مشاہیر ادب کی کتب پر تبصرہ جات شامل کر کے انہیں اُردو ادب کی تاریخ بنا دیا ہے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معظمہ نقوی کی شخصیت بہت ہی اعلیٰ پایہ کی ہے اور اُن کی تصانیف بھی قارئین کے لئے اعلیٰ پایہ کی جانی مانی جاتی ہیں۔ اس سے قبل وہ ایک شعری انتخاب "کف دست" اور ایک سلام کا انتخاب "مودت نامہ" اربابِ علم و دانش کی نذر کر کے خاصی پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں معاشرتی بگاڑ اور معاشرتی ناہمواریوں سمیت علاقائی مسائل کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ صنف نازک کو درپیش چیلنجز اور ان کی محرومیوں کو بھی اپنا ذریعہ اظہار بناتی ہیں۔ (۳۲)

حوالہ جات

۱. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی" زوہیب پبلشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳ء ص:۲۶

۲. Dailyswail.com

۳. ایضاً

۴. معظمہ نقوی کا ذاتی انٹرویو مورخہ ۸ مئی ۲۰۲۳ء

۵. ایضاً

۶. ایضاً

۷. ایضاً

۸. ایضاً

۹. ایضاً

۱۰. ایضاً

۱۱. معظمہ نقوی، نوائے نقوی زوہیب پبلشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۷۵

۱۲. ایضاً، صفحہ:۷۶

۱۳. Pressforpeace.org.uk

۱۴. معظمہ نقوی کا ذاتی انٹرویو، مورخہ ۲۰ مئی ۲۰۲۳ء

۱۵. ایضاً

۱۶. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی" زوہیب پبلیشرز حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳ء، ص: ۲۶

۱۷. ایضاً

۱۸. معظمہ نقوی کا ذاتی انٹرویو، مورخہ ۲۰ مئی ۲۰۲۳ء

۱۹. ایضاً

۲۰. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳ء، ص:۹

۲۱. ایضاً

۲۲. معظمہ نقوی کا ذاتی انٹرویو، مورخہ ۲۱ مئی ۲۰۲۳ء

۲۳. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳ء، صفحہ: ص کے آغاز میں

۲۴. معظمہ نقومی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۱۸

۲۵. ایضاً، ص:۲۰

۲۶. ایضاً

۲۷. ایضاً، ص:۲۱

۲۸. ایضاً، ص:۲۲

۲۹. ایضاً

۳۰. ایضاً

۳۱. ایضاً، ص:۲۵

۳۲. ایضاً، ص:۲۶

باب دوم
تحقیقی مضامین

تحقیق کیا ہے؟

تحقیق کا لفظ عربی زبان سے لیا گیا ہے، جس کا مادہ یعنی اصل (ح ق ق) ہوتا ہے۔ جس کا تعلق باب تفصیل سے ہے، اور اس کے لغوی معنی کھوجنا، پرکھنا، تفتیش اور کسی بات کی تحقیقات وغیرہ کے ہیں۔ تحقیق کو انگریزی زبان میں ریسرچ بھی کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کو دوبارہ یا پھر سے دیکھنا، یا توجہ سے تلاش کرنا اور دوبارہ تلاش کرنا کے ہیں۔

رابرٹ راس نے فرمایا ہے کہ:

"یہ فرانسیسی لفظ ریسرچ سے نکلا ہے، جس کے مطلب پیچھے جاکر تلاش کرنا کے ہیں"۔ ہندی بھاشا میں تحقیق کو انوسندھان کے معنی ٹوٹے بکھرے دھاگے کو جوڑ کر رکھنے کے بھی ہیں۔ لیکن تحقیق ایک ایسا امر ہے، جس کی اہمیت انسانی زندگی میں ہمیشہ باقی رہے گی اور کبھی ختم نہیں ہوگی"۔(۱)

اس اصطلاح کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے جڑا ہوا ہے۔ زندگی کے ہر میدان میں اس کی ضرورت پڑتی ہی ہے، اور اس کے بغیر دراصل تحقیق ان طریقوں کا خاص اور مستحکم مجموعہ ہے، جو کسی مسئلے یا گہرائی میں مسئلہ جاننے اور جس علاقے میں اس کا اطلاق ہو رہا ہے، اس میں جدید علم پیدا کرنے کے مقصد سے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ سائنسی پیشرفت کے لئے بھی ایک اہم وسیلہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ قابل اعتماد پیرامیٹرس کے سات مفروضوں کو جانچنے یا مسترد کرنے کی اجازت سائنسدان یا محقق کو دیتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اور واضح مقاصد کے ساتھ۔ اس طرح اس بات کی ضمانت دی جاسکتی ہے، کہ تفتیشن علم کے شعبے میں دیئے جانے والے تمام شراکت کی تصدیق اور نقل کی جاسکتی ہے۔ انسان نے دنیا میں آتے ہیں اپنی نئی نئی تخلیقات سے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی ہے کہ انسان ازل سے ہی کھوج اور پرکھ کا خواہاں رہا ہے۔ انسان کی یہی تحقیقی صلاحیت اور خواہش کی وجہ سے اس کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا ہے۔

"یہ تحقیق کی صلاحیت ہی تو تھی جس نے آدم کو آگ پیدا کرنے سے لے کر گول پہیے کی سوار بنانے تک کا درس دیا"۔(۲)

انسان شروع ہی سے متجسس جبلت کا حامل ہے۔ کیا، کیوں اور کیسے جیسے لفظوں کی تشفی کے لئے اس نے کھوج شروع کی، اور کائنات کے کئی راز اور پوشیدہ پہلو کھول کر رکھ دیے۔ اس کی متجسس جبلت نے کائنات کے مادی، حیاتیاتی اور سماجی پہلوؤ کے بارے میں ایسی معلومات دیں، جس کی وجہ سے آج دنیا ایسی شکل میں موجود ہے، جو ایک بحر رواں کی مانند چل رہی ہے۔ تاہم انسان کا تجسس اسے کہیں ٹکنے نہیں دیتا، اس لئے خوب سے خوب تر اور نئی دُنیاؤں کی کھوج میں آج بھی سرگرداں ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔

تحقیق (Research) کا مطلب ہے، مسائل آج بھی سرگرداں ہے اور ہمیشہ رہے گا۔" تحقیق (Research) کا مطلب ہے مسائل کو حل کرنے کے لئے بہت احتیاط کے ساتھ سائنسی طریقوں کو استعمال کرتے ہوئے تجزیاتی مطالعہ کرنا، جس سے مسئلے کا حل یا خود مسئلہ کھل کر سامنے آجائے"۔(۳)

تحقیق اگر منظم یعنی سسٹمیٹک طریقے اور منطقی انداز سے کی جائے تو اس سے بات نیا علم بھی تخلیق ہوتا ہے۔ ہم جس تحقیق کی بات کر رہے ہیں وہ تعلیم کے حوالے سے ہے، یعنی تحقیق کسی بھی چیز کے بارے میں۔ اگر آپ نے تحقیق کرنی ہے تو آپ کو موضوع سوچنا ہو گا، یا وہ مسئلہ کھوجنا ہو گا، جس کے بارے میں آپ تحقیق کرنے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس سے متعلقہ سوالات کی فہرست بھی ہونی چاہیے، جن کے سوالات آپ تلاش کریں گے۔

تحقیق کی کئی اقسام ہیں۔ "جب ہم کسی بھی بنیادی سائنسی نظریہ (تھیوری) پر کام کرتے ہیں تو اسے بنیادی تحقیق (Basic Research) کہتے ہیں۔ دوسری قسم میں ہم کسی عملی یعنی پریکٹیکل پرابلم کو حل کرتے ہیں، تو اسے اطلاقی تحقیق (Applied Research) کہا جاتا ہے۔ جس Research میں ہم اعداد و مقدار کی بات کرتے اور شماریات (Statistics) کے ذریعے اپنے نظریات کو پیش کرتے ہیں، اُسے (Quantitative Research) کہتے ہیں۔ اگر تجربات اور دلائل کے ذریعے کسی نظریے کو ثابت کیا جائے تو اُسے (Qualitative Research) کہتے ہیں۔ جبکہ کسی بھی ایک عمل کو بار بار اتنی بار دہرانا کہ جب تک متوقع نتائج سامنے نہ آجائیں، اُسے (Iteractive Research) کہا جاتا ہے۔

تحقیق کے لئے آپ کو مرحلہ وار عمل کرنا پڑتا ہے، جیسے پہلے مشاہدہ، پھر پس منظر کی تحقیق، اس کے بعد مفروضات سامنے رکھنا، اور پھر اسی حوالے سے سادہ سا لائحہ عمل یا تجربہ کرنا۔

تحقیق کا اطلاق:

"تحقیق صرف آپ اپنی ذات کے لئے نہیں کرتے، بلکہ کسی بھی موضوع یا چیز کی گہرائی میں جا کر کچھ ایسے نتائج سامنے لاتے ہیں، جو ہر ایک کے لئے فائدہ مند ہو اور اگر بعد کے لوگ اس تحقیق کو مزید جاری رکھنا چاہتے ہو تو آپ کی محنت ان کے کام آئے"۔(۵)

اس لئے آپ کی تحقیق کا معیار بہت اعلیٰ ہونا چاہیے، تاکہ اس کا اطلاق مستقبل کے کسی بھی منصوبے پر ہو سکے۔ "کسی بھی چیز پر تحقیق کرنا کسی چیلنج سے کم نہیں ہوتا، لیکن کامیابی کی صورت میں جو اعزاز و اکرام آپ کے حصے میں آتے ہیں، اس کا بھی کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ اسی لیے جب آپ کو موقع ملے تو اپنی دلچسپی کے موضوع پر گہرائی میں جا کر تحقیق کریں، چاہے وہ آپ کی ڈگری کا لازمی حصہ ہو یا پھر ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ"۔(۶)

تحقیق کے دوران طلباء نہ صرف اپنی معلومات و تجربات میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ ذہن کے دریچوں میں اُٹھنے والی اُلجھنوں کو دور کرتے ہوئے سوالات کے جوابات ڈھونڈتے ہیں۔ "مختلف توجیہات و اُلجھنوں کو دور کرتے ہوئے سوالات کے

جوابات ڈھونڈتے ہیں۔ مختلف توجیہات و مروضات کے بارے میں ان کے دماغ میں جو ابہام ہوتا ہے وہ اسے دور کرتے ہیں اور اس سے معاشرے کو بھی فائدہ ہوتا ہے"۔(۷)

مزید یہ کہ کوئی بھی طالبعلم اپنے کسی مضمون یا موضوع پر تحقیق کر رہا ہے تو اس کے بارے میں پہلے سے موجود علمی مواد کا مطالعہ اس کے علم اور مہارت میں زبردست اضافہ کرتا ہے، وہ تمام تر حقائق سے آگاہ ہوتا ہے اور اس کے لئے تجزیہ کرنا آسان ہوتا چلا جاتا ہے۔ کسی بھی موضوع پر تحقیق کے حوالے سے یا مسائل کا حل ڈھونڈنے کے لئے کئی پہلو سامنے آتے ہیں اور ایک کے بجائے کئی راستے یا طریقے سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔

"جب طالب علم پہلے سے شائع شدہ تحقیق کے مضامین کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے دماغ کے بند دریچے کھلتے چلے جاتے ہیں، جس سے اس کا اپناؤ جدان تیز ہونے لگتا ہے کہ آیا اس کی دلچسپی بڑھ رہی ہے یا کم ہو رہی ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے کہ وہ تحقیق کو جاری رکھنے یا نہ رکھنے کے بارے میں فیصلے کر لے"۔(۸)

تحقیق کا ایک طریقہ کار ہوتا ہے، جس کے مطابق آپ کو اپنی تحقیق مرحلہ وار آگے بڑھانی ہوتی ہے، یہ ترتیب کچھ اس طرح سے ہے۔

تحقیقی مطالعہ ترتیب دینے کے لئے بہت زیادہ مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس مطالعہ سے بھرپور فائدہ اُٹھانے کے لئے نوٹ لینا بہت مفید ثابت ہوتا ہے، مطالعہ اور نوٹ لینے کے لئے کچھ اُصول ہیں۔ اس لئے کہ لائبریریوں میں کتابوں کے ازحام کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی عمر نوح بھی لے کر آئے تو ناکافی ہوگا، اس لئے ہر تحقیق کار کے اندر اتنی صلاحیت ہونی چاہیے کہ کتابوں کی فہرست اور کتابوں کو فوراً پہچان لے اور بڑی سرعت سے یہ نہیں۔ اسکالر کو کتابوں کو بڑی تیزی سے پڑھنے کی عادت ڈالنی چاہیے، اگر کسی موضوع پر کام نہیں ہوا ہے، تو زیادہ اُمید یہ کہ اس کے متعلق مواد مختلف کتابوں میں تھوڑا تھوڑا بکھرا ہوا ہوگا۔ ایک کامیاب اسکالر کیلئے اپنے موضوع کی مفید کتابوں اور ان میں بھی اپنے کام کی عبارت کو محفوظ کرنا اور نوٹ لیتے وقت یہ خیال بھی ضروری ہے۔ آپ ایک نیا مقالہ اور نئی کتاب لکھ رہے ہیں۔ آپ کو اپنی طرف سے کچھ لکھنا ہے اور اس طرح کہ نیا معلوم ہو کہتے ہیں کہ اگر آپ نے کتابیں پڑھ لی تو دسویں کتاب ترتیب دے سکتے ہیں۔ لیکن اس میں تحقیق کا رنگ نہیں آسکتا ہے، اس میں تحقیق کی چاشنی محسوس نہیں کی جاسکتی ہے۔ بیول جانسن کا قول ہے، کہ ایک کتاب لکھنے کے لئے آدھی سے زیادہ لائبریری پڑھ ڈالے، اتنے زیادہ ماخذ کو دیکھا جائے تو یقیناً تحقیق میں جان پیدا ہوگی۔ اسکالر کے لئے ضروری ہے تیزی سے زیادہ سے زیادہ کتابیں دیکھ جائے اور سونگھ کر مواد ڈھونڈ لینے کی مشق کرے۔ کتابوں میں ابواب کے عنوان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس باب کو دیکھنا چاہیے اور کس کو پورا چھوڑ دینا چاہیے"۔(۹)

اسی طرح رسالے کی فہرست مضامین سے اپنے کام کا مضمون اور پھر مضمون سے اپنے کام کے اجزاء تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ مطالعہ کا آغاز کس کتاب سے کیا جائے۔ اس سلسلے میں لوگوں کی مختلف رائے ہیں، بعض حضرات کی رائے ہے کہ اولین

مواد دیکھے جائیں، دوسری رائے ہے موضوع پر سب سے اچھی کتاب سے مطالعہ کا آغاز کیا جائے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ پہلے نئی تحریروں کو پڑھا جائے، یہ پرانی تحریروں سے بے نیاز کر دیگی۔ ایک رائے یہ ہے کہ جس میں سب سے زیادہ مواد ملنے کی اُمید ہو پہلے اُسے پڑھا جائے۔

"جتنا مطالعہ کیا جائے اس میں سے چند مفید اجزاء کا نوٹ تیار لینا مفید ہے، اس لئے کہ ہر کتاب ہر وقت آپ کے پاس نہیں رہتی ہے، اور تمام باتیں حافظہ میں مستحضر نہیں رہتی ہیں اس لئے نوٹ لینا ضروری ہے"۔(۱۰)

تحقیق کا مضمون:

"کسی کی طرف جانے سے پہلے تحقیقی مضمون کی مثالیں، نوٹ تحقیقی مضمون کی ایک قسم ہے، جو مصنف کو دوسروں کے کام کا تجزیہ کرنے اور ان کے نظریات اور افکار کو اپنے سے تقابل کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ نیز تحقیقی مضمون ایک واضح طور پر تحریری اور منظم مضمون ہے"۔(۱۱)

مزید بر آن، اس میں ماخزی مواد کی تحقیق کرنا، اور جو کچھ آپ سیکھتے ہیں اُسے اپنے نظریات سے ترکیب کرنا شامل ہے۔ مزید بر آن، براہ کرم نوٹ کریں، مقالہ کا سب سے اہم حصہ ہے اور ہر تحقیقی مضمون میں ایک اصل مقالہ ہوتا ہے۔ نیز تھیسز بھی ظاہر کرتا ہے، مضمون نگار پوری تحقیق اور اچھی تحریر، اضافی طور پر ایک تحقیقی مضمون میں تمام مضامین کے لئے مخصوص ڈھانچہ ہوتا ہے، تعارف، جسم اور اختتام۔

حسرت کاشاعر۔شفقت کاظمی

"جنوبی پنجاب کے شہر ڈیرہ غازی خان کی سرزمین ادب کے حوالے سے نہایت زرخیز ہے۔ اس سرزمین نے نامور قلمکار تخلیق کئے جو کہ بین الاقوامی سطح پر نہ صرف اپنے ملک کی پہچان کا حوالہ بنے بلکہ ان کے شہر کو بھی انہی کے نام و کام سے جانا جاتا ہے۔ ان بے شمار اور نامور ستاروں کی کہکشاں میں جو ہستی مثلِ قمر بن کر اُبھری وہ سید فضل الحسن رضوی المعروف شفقت کاظمی کی تھی"۔(۱۲)

آپ کی شخصیت کے کچھ ذاتی، سماجی، فنی و فکری پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی سعی کریں گے۔ جس ہستی نے محسن نقوی جیسے گراں قدر کو تخلیق کیا اور جس رئیس المتغزلین نے اپنا شاگرد و جانشین مقرر کیا وہ بھلا کوئی عام ہستی ہو گی! آپ کے فن و شخصیت پہ اب تک چار ایم۔فل کی تحقیقی مقالہ جات کئی یونیورسٹیوں سے ہو چکے ہیں۔

آپ پر پہلا ایم۔فل کا مقالہ مسز انیس فاطمہ نے بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے کیا، جبکہ ڈاکٹریٹ کی سطح پر آپ پہ اب تک ایک ریسرچ ورک ہوا، مگر تاحال تشنگی باقی ہے، کیونکہ ایک مخصوص طبقہ کے افراد ہی اس کام سے مستفید ہو سکتے

ہیں۔ میری اس ناتواں کاوش سے پہلے ڈی۔جی۔خان کے نواحی علاقہ سے تعلق رکھنے والے ادیب وشاعر دلبر حسین مولائی نے اپنی کتاب وسیبی سخنور تذکرۃ الشعراء(۲۰۰۸ء) میں آپ کی فکری وفنی کاوشوں کو اُجاگر کرنے کی بھرپور سعی کی۔

"آپ ۱۴ فروری ۱۹۱۴ء کو ڈیرہ غازی خان شہر بلاک نمبر ۴۶ میں اپنے آبائی گھر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی سید سید علی جبکہ آپ کی والدہ محترمہ کا نام سیدہ دولت بی بی تھا۔ آپ نجیب الطرفین سید تھے۔ آپ کا شجرہ نسب گلدستہ امامت کے آٹھویں تاجدارِ گل امام علی الرضاء سے ملتا ہے۔ آپ کا ایک بھائی اور ایک بھائی اور ایک بہن سیدہ مراد بی بی تھیں۔ آپ کی مادری زبان سرائیکی تھی"۔(۱۳)

یہی وجہ ہے کہ ابتداء میں آپ نے سرائیکی زبان میں شاعری کی۔گھر کا ماحول سادہ اور مذہبی تھا۔ "آپ کے والد ۱۳۰۱۲ روپے ماہوار پنشن لیتے۔ آپ کی والدہ گھر پر سلائی، کڑھائی کرکے کچھ رقم جوڑ دیتی، جس سے گھر کا گزر بسر اچھا جاتا۔ آپ نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی، اور ذاتی طور پر فارسی وار دواب کا مطالعہ کیا۔ آپ کو بے شمار اشعار زبانی یاد تھے، جو آپ کے ادب سے گہرے شفقت کے غماز بنے"۔(۱۴)

کم عمری میں آپ مرگی کے مرض میں مبتلا ہوگئے اور بارہ سال کے طویل عرصے کے بعد مسلسل دوا اور دُعا کے بعد آپ کو اس مرض سے مکمل شفاء ملی۔ "پیشے کے اعتبار سے آپ مقامی میونسپل کمیٹی میں بطور چپڑاسی بھرتی ہوگئے، ترقی کرکے محرر چنگی اور پھر ریکارڈ کیپر تعینات ہوئے۔ مگر کچھ وجوہات کی بناء پر اپنی مقررہ معیاد سے تین سال قبل پنشن لے لی۔ آپ کی ازدواجی زندگی میں آپ کی ایک زوجہ جو رشتہ میں آپ کی چچازاد سیدہ سکینہ بی بی تھیں"۔(۱۵)

جن کے بطن سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ بڑے بیٹے کمسنی ہی میں وفات پاگئے، جبکہ دوسرے حالتِ دوام بخشی۔ مگر آپ کا سلسلہ نسل آگے نہ بڑھا سکے، آپ کی طبیعت نہایت سادہ اور متوسط تھی۔ آپ کم گو اور سادہ لباس زیب تن فرماتے۔ جناب کیپ پہنچے۔ سادہ خوراک و پرہیزی غذا کا استعمال کرتے۔ فنی زندگی کا آغاز آپ نے ۱۸ سال کی عمر سے کیا۔

"آپ نے اس سلسلے میں ندیم جعفری سے رُجوع کیا، جو کہ ڈی۔جی۔خان کے بڑے شعراء میں سے تھے۔ انہوں نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ مولانا حسرت موہانی سے اس حوالے سے رابطہ کریں۔ چونکہ آپ نے حسرت موہانی سے رُجوع کیا تو انہوں نے آپ کو اپنا شاگرد بنانے سے صاف انکار کردیا، لیکن آپ نے ہمت نہ ہاری اور سچی لگن سے ان سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اک غزل ان کی زمین میں ہی لکھ کر آپ نے انہیں بھیجیں جسے پڑھتے ہی انہوں نے آپ کو برملا اپنا شاگرد و جانشین قبول کیا اور اس غزل کو اپنے پرچہ "اُردو معلّٰی" میں نہ صرف شائع کیا بلکہ آپ کے نام سے کم نہ تھا، اور آپ وہ واحد ہستی ہیں جن کو رئیس المتغزلین کا شاگرد ہونے کے ساتھ جانشین حسرت موہانی لکھا"۔(۱۶)

یہ اعزاز آپ کیلئے کسی گولڈ میڈل یا ستارہ امتیاز سے کم نہ تھا اور آپ وہ واحد ہستی ہیں جن کو رئیس المتغزلین کا شاگرد ہو نے کے ساتھ جانشین ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد آپ کا کلام یکے بعد دیگرے نہ صرف ان کے رسالے میں چھپتا

رہا بلکہ تمام برصغیر کے اہم ترین ادبی جریدوں میں شائع ہوا، جن میں سے کچھ اہم نہ یہ ہیں۔ سیارہ، اقدام، سیپ، اُردو ادب آئین، نادان، پگڈنڈی، نقوش، نگار، ساقی، قندیل، فانوس، تہذیب الاخلاق، جامِ نو، شہباز، امروز، نفرت، آفاق، ادبِ لطیف، الحمراء، فاران اور نیرنگ خیال شامل ہیں۔ "آپ نے خود کو ہمیشہ "خاکپائے حسرت" لکھا اور کہلوایا اور اپنے ہر دیوان کا نام حسرت ہی پر رکھ اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار فرمایا۔ شفقت کاظمی نے جس دور میں قلم اُٹھایا، اس وقت پورے برصغیر میں اُردو غزل کی دھوم مچی تھی"۔(۱۷)

وہ اصغر گونڈوی، صفی لکھنوی اور جگر مراد آبادی جیسے شعراء کا زمانہ تھا۔ شفقت نے جنوب مغرب میں بیٹھ کر اپنی اُردو غزل کا لوہا منوایا۔ اس حوالے سے ماہر القادری فرماتے ہیں کہ: "شفقت نے حسرت کے اسلوب کو غزل میں جس طرح نبھایا اور ان کے رنگ کو قائم رکھا بس وہ انہی کا حصہ ہے"۔(۱۸)

حسرت کو رئیس المتغزلین کہا جاتا ہے جبکہ شفقت امام المتغزلین ٹھہرے اور کیوں نہ ہوں سید الاحرار کا جانشین ہونا کسی عام ہستی کے بس کی بات نہ تھی، وہ ہستی سید الاسرار ہی ہو سکتی تھی۔ تحقیق میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ آپ کی شریف سفر آپ سے بہت جلد بچھڑ گئیں۔ ان کے داغ مضارقت نے آپ کا قرطاس و قلم سے رشتہ مضبوط کر دیا۔ آپ نے اپنے کرب کو خواہ وہ عشقِ حقیقی میں ملا یا مجازی میں ہر زخم کو سخن کی مرہم لگائی۔ تبھی تو وہ برملا کہہ اٹھتے ہیں کہ:

؎ مارا ہوا ہوں وعدہ بے اعتبار کا — چسکا سا پڑ گیا ہے تیرے انتظار کا (۱۹)

؎ نہ رہا اس سے واسطہ شفقتؔ — سلسلہ ختم ہے کہانی کا (۲۰)

؎ ہم نے اک دیا جلایا تھا — جانے اسے کیوں بجھایا تھا (۲۱)

؎ چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے — ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے (۲۲)

؎ نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی — مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں (۲۳)

؎ آرزو تیری برقرار رہے — دل کا کیا ہے رہا رہا نہ رہا (۲۴)

؎ تیری محفل سے اُٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال — دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر دیا (۲۵)

؎ شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ — سنتے ہی دل میں جو اُتر جائیں (۲۶)

جنوبی پنجاب کے آپ وہ پہلے غزل گو شاعر ہیں، جن کی غزل صاف اور شائستہ زبان میں ہے۔ آپ نے ہمیشہ آسان بحر میں شاعری کی۔ عشق ولایت و محبت اہل بیت (علیہم السلام) کے حوالے سے آپ کا مناقب و سلام کا ایک ضخیم ذخیرہ موجود تھا۔

آپ کی مجازی شاعری میں نغمیت، موسیقیت، معنی آفرینی، جدت تشبیہات و استعارات کا چن امتزاج ملتا ہے۔ آپ ایک سچے محب وطن شہری تھے۔ اپنی مٹی سے وفا آپ کے بدن میں لہو بن کر دوڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں ملی نغمے اور مجاہدین وطن کو خراج عقیدت و تحسین اور سلام بھی ملتے ہیں۔

؎ اے ارضِ وطن کے پاسبانو بے باک و دلیر نوجوانو (۲۷)
؎ آگئے ساعت جہاد فی سبیل اللہ کی اب خبر لینا ہے تم کو دشمن بد خواہ کی

اسی طرح ان کے چند عشق مجازی کے اشعار پہ نظر ڈالتے ہیں:

؎ اُمید کوئی نہ کوئی وعدہ ہم تجھ سے کریں نباہ کب تک (۲۷)
؎ میں کہیں بھی امان پا نہ سکوں تو اگر مجھ پہ مہربان نہ رہے
؎ ذکر میرا جو درمیان نہ رہے رونق بزم دوستاں نہ رہے
؎ یوں ترا درد پاکے ہم خوش ہیں جیسے کوئی بڑا خزانہ ملا (۲۹)

آپ کے کلام میں اپنے اُستاد محترم کا اندازِ تکلم صاف چھلکتا ہے۔ حسرت موہانی فرماتے ہیں کہ:

؎ مرے ڈحب کی کسی نہ بھی نہ کہی یوں تو کتنے پیام بر آئے (۳۰)
؎ حسرتؔ کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری سنتے ہیں عاشقوں پہ تمہارا کرم ہے آج (۳۱)
؎ غم آرزو کا حسرتؔ سبب اور کیا بتاؤں مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی (۳۲)
؎ اللہ ری جسم یار کی خوبی کہ خود بخود رنگینیوں میں ڈوب گیا پیر ہن تمام (۳۳)

اور شفقت کاظمی اپنے اُستاد محترم کے متعلق کہتے ہیں کہ:

لاسکا شفقت نہ کوئی رنگ حسرتؔ کی مثال
یوں تو کتنے شاعر اِن خوش کلام آتے رہے (۳۴)

بقول آپ کے اُستاد محترم کے۔۔۔۔۔۔

شعر دراصل وہی ہوتے ہیں
جو سنتے ہی دل میں اُتر جائیں (۳۵)

آپ کی کتب کی تفصیل و اشاعت اس طرح ہوئی۔

(۱) "حسرت کدہ"

۱۹۵۷ء کو مولانا محمد افضل نے علمی کتب خانہ مظفر گڑھ سے شائع کی۔ اس کتاب میں ایک سو پانچ غزلیں اور گل صد برگ کے نام سے سترہ اشعار شامل ہیں۔

(۲) "نغمہ حسرت"

۱۹۵۹ء کو مولانا افضل صاحب نے مظفر گڑھ سے شائع کی۔ اس میں ایک سو بتیس غزلیں اور لخت لخت کے عنوان سے ستر اشعار شامل ہیں۔

(۳) "داغ حسرت"

۱۹۷۰ء کو اپنے خرچ سے لاہور سے شائع کروائی۔ اس میں ایک سو تین غزلیں اور باون متفرق اشعار شامل ہیں۔ اس میں دو غزلیں ایسی ہیں جو ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۷ء تک لکھی جاتی رہی ہیں۔ اس کا فقدم غلام رسول مہر نے اور پیش لفظ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے لکھا۔

(۴) "زخم حسرت"

آخری مجموعہ کلام ۱۹۸۸ء میں آپ کے فرزند سید نجیب الحسن رضوی نے بیکن بکس گلگشت ملتان سے شائع کروائی۔ اس کی ترتیب کا کام آپ نے اپنے ہاتھوں سے کیا تھا، مگر یوم قضاء نے اجازت نہ دی کہ آپ اس کی اشاعت اپنے دست سے کرواتے ہیں۔ اس کتاب میں ایک سو سترہ غزلیں اور ستاون اشعار شامل ہیں۔

آپ کا کلام بھارت کے ایم۔اے اُردو اور گریجویٹ کے نصاب میں آج بھی شامل ہے، اور پڑھایا جارہا ہے۔ مگر افسوس کہ آپ کو اپنے ملک و علاقہ کے بھی مخصوص طبقہ کے سوا کوئی خاص نہیں جانتا۔ "یہ المیہ ہمارے ہاں بتدریج ہے کہ ہم فانی دُنیا کے لافانی لوگوں کی قدر بہت کم کرپاتے ہیں مگر ان کا نام و کام ادب کی دُنیا میں مثلِ شمس و قمر تا ابد زندہ و تابندہ رہنے والا ہے"۔(۳۶)

آپ کی اپنی اولاد حیات نہ ہونے کے باعث آپ کے بارے میں معلومات کا ذخیرہ نہایت ناپید ہے۔ آپ کے آبائی گھر میں آپ نے نایاب کتب کی ایک ضخیم لائبریری کا انعقاد کیا۔ جس کا نام "شفقت اکادمی" ڈیرہ غازیخان تھا، جو آپ کے بیٹے کے دُنیا سے رخصت ہونے کے بعد قرابت داروں نے ردی میں بیچ کر ضائع کردی۔ جن اقرباء سے مجھے آپ کی معلومات ملی ہیں، ان کی تہہ دل سے سپاس گزار ہوں۔ انہوں نے مجھے اس عظیم کام میں رہنمائی کرکے میرے ہاتھ اندھیرے میں دیپ تھمادیا

ہے۔ آپ شدید شوگر کے مرض میں مبتلا ہونے کے باعث ۱۲ مارچ ۱۹۷۵ کو جام اجل نوش فرما کر اس دُنیا سے پردہ پوش ہو گئے۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)

دُنیائے زر نے بات نہ پوچھی تو کیا ہوا
راس آگئی ہمیں بھی خود اپنی قلندری (۳۷)

وہ ایک بات جو ہم زبان پر نہ لاسکے
شاید ہمارے بعد زمانہ سنا سکے (۳۸)

آج بھی آپ کے مزارِ اقدس پر کوئی زائر جائے تو آپ کے کتبے پہ لکھے آپ کے لفظ اس کی آنکھیں نم کر دیتے ہیں۔ کتبے پہ لکھا ہوا شعر ملاحظہ ہو!

آپ آئیں تو سہی گورِ غریباں کی طرف
بے کسی بڑھ کے بتادے گی ٹھکانہ میرا (۳۹)

آج ضرورت اس امر کی ہے، کہ کوئی صاحب حیثیت اور ادب سے عقیدت رکھنے والا بندہ آپ کے مجموعہ کلام، خطوط اور قلمی نسخوں کو یکجا کر کے کلیات کی شکل میں شائع کروائے تا کہ اس قادر الکلام ہستی کا عظیم کام محفوظ ہو سکے اور آنے والے تشنہ قلبوں کی راہنمائی بہتر ذریعہ بن سکے۔

باکمال فن کی لازوال خدمات:

یا رب تیری نگاہ کا اُمیدوار ہوں
تو ہی ناصر و نصیر و رب غفور ہے (۳۹)

سراسر تیری ذات ہے رحمان و رحیم
میرا ہر اِک جزو سراپا مصور ہے (۴۰)

سید مشتاق احمد شاہ صاحب

جس ہستی کو قلمبند کرنے چلی ہوں وہ میرے رشتے میں بزرگ محترم لازوال فن و جراتوں کے مالک پدر نانا حضور ہیں۔ آپ کا مکمل نام سید مشتاق احمد جعفری ہے۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۱۹-۰۴-۱۹۱۹ ہے۔ "آپ پیشہ کے لحاظ سے ایک پینٹر تھے۔ آپ کا شجرہ نسب حضور پاک ﷺ کی آل اظہار سے حضرت علی المرتضیٰؑ کے بیٹے امام جعفر صادقؑ کے فرزند العراضی سے منسوب ہے۔ اسی طرح آپ کے ننھیال بھی آل رسول (علیہم السلام) میں سے امام موسیٰ کاظمؑ کے نسب سے منسوب ہیں"۔ (۴۱)

آپ کے نانا جان سید احمد شاہ کاظمی معروف کلاسیکل شاعر "سید فضل الحسن" المعروف "شفقت کاظمی" صاحب کے برادر نسبتی ہیں۔ اس طرح آپ نجیب الطرفین سید تھے اور آپ کے دودھیال میں حضرت شاہ عیسیٰ بلوٹ شریف جن کا مزار بلوٹ شریف ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں ہے، اور حضرت شاہ شمس تبریز جس کا مزار مدینہ الاولیاء ملتان میں ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب انہی جید الاولیاء اللہ سے جڑا ہوا ہے۔ آپ کے دادا سید احمد شاہ صاحب ملک ایران سے ہجرت کر کے پاکستان کے پرانے شہر "ڈیرہ غازی خان" پہنچے اور یہاں سکونت اختیار فرمائی تو یہاں کی زبان "سرائیکی" بنی۔ لیکن آپ اس کے علاوہ دیگر زبانوں کو اچھی سمجھتے اور جانتے تھے۔

"آپ کی پُر اثر شخصیت میں آپ کا دھیما لہجہ "صاف گوئی" انصاف پرستی، اصول پسندی، گندمی رنگت اور قد ۵ فٹ ۵ انچ تھی۔ سروس کے دوران جناح کیپ اور شیروانی، سرمئی کوٹ، بھورا اور کالے رنگ کا زیب تن کرتے تھے جبکہ معمول میں سادہ شلوار قمیض کے ساتھ جناح کیپ پہنتے تھے۔ ہلکی پھلکی اور صاف ستھری غذا کرتے تے۔ رزق حلال کو اپنا شعار رکھنا اور حرام سے نفرت کرنا ہمیشہ ان کا خاص وطیرہ تھا"۔(۴۲)

جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ محنت اور مشقت کر کے حلال رزق کماتے تھے۔ انہوں نے بھی ایسے ہی اپنی روزی کو حلال کیا تھا۔ آپ کا گھریلو ماحول انتہائی سادہ اور پیروکار تھا۔ بالکل سادہ قسم کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ سادات گھرانہ ہونے کے ناطے انتہائی باپردہ، پاک و پاکیزہ اور تعلیم یافتہ تھا۔ آپ کے والد محترم "سید اللہ وسایا شاہ صاحب" تعلیم یافتہ بزرگ تھے، اور آپ کے دادا "سید احمد شاہ صاحب" بھی حکومت برطانیہ کے دور میں اپنا ایک بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ جبکہ اس سے پہلے آپ کے گھرانے کو ایک نمایاں مقام حاصل تھا۔ گزشتہ کئی نسلوں سے وہ ذریعہ معاش کے ساتھ کیلی گرافی، فن پارہ اور برصغیر کے معروف فن نقاشی و خطاطی سیکھنے اور سکھانے میں مصروف تھے۔ یہ آپ کا آبائی خاصہ تھا جس کو آپ نے بھی اپنے شوق میں پوری زندگی قائم رکھا۔ آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز پندرہ برس کی عمر سے ہی شروع کر لیا تھا۔

"دُنیاوی تعلیم مکمل کی تو آبائی شوق نے آپ کو سوچوں میں ارتعاش پیدا کر دیا، جس کے باعث آپ نے دستکاری کالج کا رُخ کیا اور اپنے آبائی ہنر اور شوق کو نیا انداز دینے کی ٹھان لی۔ ووکیشنل کی سند حاصل کرنے کے بعد دور جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کی غرض سے فن فوٹو گرافی جو کہ اُس زمانے میں ایک نئی ایجاد تھی"۔ (۴۳) حاصل کرنے کی غرض سے دہلی کا رُخ کیا جہاں سے یہ فن تھوڑے ہی عرصے میں حاصل کرنے کے بعد لاہور پہنچ کر اپنے فن کو عام کرنے کی غرض سے کمرہ اور لیبارٹری کے لوازمات خریدتے ہوئے اپنے آبائی شہر ڈی۔جی۔خان آکر یہاں کے لوگوں کو اس جدید سہولت سے آراستہ کرنے کے لئے ایک فوٹو گرافر لیبارٹری قائم کر لی۔ مگر اس جدت کو اپنانے کے ساتھ آپ نے اپنے آبائی فن کو بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ آگے بڑھایا۔ جب تقسیم ہند پایہ تکمیل کو پہنچی تو اپنی تعلیمی اور فنی قابلیت کی بناء پر گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس

کے محکمے میں بطور پینٹر سرکاری خدمات پر معمور ہو گئے۔ بے حد مصروفیت اور وقت کی قلت کے باعث اپنے بھائی سید منظور احمد شاہ کو اپنے فوٹو گرافی میں باقاعدگی کے ساتھ تربیت دینی شروع کر دی۔

یہی وجہ ہے کہ وہ آج شہر ڈیرہ غازی خان کے سب سے پہلے فوٹو گرافر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ آج بھی ان کے درجنوں شاگرد اس فن کو قائم رکھے ہوئے ہیں اور صدر انجمن فوٹو گرافرز سید منظور شاہ کے نام سے ایوارڈز بھی اپنے نام کیے۔ جب فوٹو گرافی میں چھوٹے بھائی نے مقام پالیا۔ "آپ نے اپنے آبائی فن کی طرف پوری توجہ دی اور اپنے کئی نامور شاگرد پیدا کئے۔ جن میں معروف "بشیر کاتب صاحب" کا نام سر فہرست ہے۔ جن کے شاگرد "شمیم الخطاط صاحب" کو آج ایک نمایاں مقام حاصل ہے، اپنے فن کو زندگی دینے کے لئے فنکار اپنی محنت اور سوچ کو دوسروں تک پہنچا کر ہی خوشی محسوس کرتا ہے"۔ (۴۴)

یہی وجہ ہے کہ آپ کے دروازہ پر آکر اپنی تشنگی کو سیر اب کیا، دُنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم پر بھی آپ نے بھرپور توجہ دی۔ قرآن کریم کی تعلیم ترجمہ و تفسیر کے ساتھ ساتھ حاصل کی۔ دُنیاوی تعلیم سیکنڈری درجہ تک حاصل کی۔ دینی علوم میں قرآن کریم مع ترجمہ و تفسیر کے علاوہ علم الاعداد، علم الجد، علم نجوم، علم ہندسہ، علم جفر کے ماہر ہونے کے ساتھ ان کے مانے ہوئے عاملِ عملیات تھے۔

"انہوں نے بارہا مرتبہ روحانی چلے بھی پورے کیے، ان کا مشہور چلّہ پیر سید ملّا قائد شاہ کے مزار پر تھا۔ اپنے عملیات کے فیض سے بہت سے لوگوں کے گھریلو، دینی و دُنیاوی، کاروباری اور روحانی مسائل حل کیے"۔(۲۵)

یہی وجہ ہے کہ آپ کے دیئے ہوئے فیض کی بدولت جب نافرمان اولاد بھی اپنے والدین کی تابع فرمان ہونے لگی تو ملک سعودی عرب سے شاہی گھرانے کے "شیخ صالح محمد" آپ کے دولت کدہ پر خود چل کر آئے اور آپ کی عملی طاقت و بصیرت کا اعتراف کیا، اور مسلسل اصرار کے بعد آپ کو اپنے ساتھ سعودی عرب لے گئے۔ آپ نے وہاں بھی شاہی خاندان کے کئی بگڑے ہوئے بے راہ روی کا شکار جوانوں کی اصلاح فرمائی اور سات ماہ تک ارضِ مقدس پر مہمان رہے۔ حج و عمرہ کی سعادت حاصل کی اور وطن واپس لوٹ آئے۔ آپ ہر دینی مسئلہ پر تمام مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والا آدمی آپ سے کسی بھی مسئلے پر معلومات حاصل کرتا تو آپ اس کو جس امام کا وہ پیروکار ہوتا، اسی کے فتویٰ و بیان کے مطابق مطمئن کرتے۔ کسی بھی ضروری مسئلے کی وضاحت میں ہر وہ دلیل پیش کرتے جو قرآن و سنت کی روشنی میں ہوتی۔ اسی طرح دین داروں اور پرہیز گاروں کے لئے آخرت میں اچھی بشارت سنائی گئی ہے۔

"بے شک واسطے پرہیز گاروں کے لئے کامیابی"(۴۶)

آپ کی ذاتی لائبریری میں تفسیر قرآن پاک، مودودی، علامہ حسین بخش، جاڑا کی تفاسیر، آئمہ طاہرین رضی اللہ عنہ کی سوانح حیات "چودہ ستارے" تواریخ کی کتب میں تاریخ طُوسی اور تاریخ طبریٰ وغیرہ شامل تھیں۔ آپ کا حلقہ احباب لامحدود

تھا، مگر چند معروف شخصیات جن میں ڈاکٹر غلام فرید خان، ڈاکٹر نذیر شہید، پروفیسر سید محمد شاہ نقوی، شمس العباس شمسی اور زوار حاجی غلام عباس زرگر وغیرہ بھی شامل تھے۔ "آپ "مسجد خواجگان "بلاک نمبر ۸ کو اپنے فنس سے مزین کرتے ہوئے گنبد کی بلندی سے گر پڑے، جس کے باعث آپ کے دائیں پاؤں کی ایڑھی زخمی ہوگئی اور آپ ہرنیا کی تکلیف میں مبتلا ہوگئے اور اپنے محدود وسائل کے باعث مکمل علاج نہ کرواسکے "۔(۴۷)

یہی تکلیف طویل عرصہ تک قائم رہی اور صحت مسلسل خراب ہوتی چلی گئی، بالآخر اسی مرض کے اثرات کے باعث ۲۴ جون بروز ہفتہ کو معمولی بخار میں مبتلا ہوئے اور ۲ جون، ۲۴ رمضان المبارک ۱۹۸۴ء بمطابق ۱۹۰۶ ہجری بروز اتوار کو بوقت نماز صبح اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ

"ہر زی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے"۔(۴۸)

یوں علوم و فنون کا ایک مکمل باب منوں مٹی تلے جابسا۔ آپ کے فنون میں ہومیوپیتھک کورس، فن فوٹو گرافی، مہر سازی، فن شیشہ و کلی سازی، فن مصوری اور پینٹنگ (تصور کشی) شامل ہیں۔

علامہ محمد اقبالؒ کا نظریہ تعلیم اور مغربی تہذیب پر ان کے افکار:

علامہ اقبال کے نظریہ تعلیم کو سمجھنے، جانچنے اور پرکھنے کے لئے ان کی شاعری اور ان کے افکار کا عمیق مطالعہ ناگزیر ہے۔

"علامہ اقبال صاحب نے تعلیمی مسائل پر خصوصی توجہ دی ہے۔ انھوں نے جہاں اپنی شاعری میں تعلیم و تربیت سے متعلق پر اثر اشعار کہے ہیں"۔(۴۹)

وہی نثری نگارشات میں بھی تعلیمی مسائل کو خاص اُجاگر کیا ہے۔ علاوہ ازیں وہ طویل عرصے تک درست و تدریس کے شعبے سے منسلک اور باریک بینیوں کا خاص تجربہ حاصل تھا۔ ان کے ہاں تعلیم کا ایک مربوط اور جامع نظام موجود ہے، جو انھوں نے قرآن مجید سے اخذ کیا ہے، اور یہ عین اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے۔

"اقبالؒ ایک ایسے جینئس شاعر ہیں جن کے ہاں ایک مربوط نظام فکر موجود ہے۔ ان کی شعری اور نثری تخلیقات کو ساتھ ساتھ رکھ کر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں ان کے ہاں ایک نوع کا فکری ارتقاء ملتا ہے۔ قرآن مجید کی تعلیمات میں گہرا انہماک کثرت مطالعہ، متعدد علمی ابقار نیز اہل علم سے مسلسل ذہنی روابط نے اقبالؒ کے افکار میں آفاقی روح پیدا کر دی تھی"۔(۵۰)

"اقبالؒ نے نظام فکر کو ہم نظام شمسی سے تشبیہہ دیں تو اس میں خودی کا سورج کا درجہ حاصل ہو گا"۔(۵۱)

اس کی روشنی اقبال کے دیگر افکار کو توانائی بخشتی ہے۔ اس نظام فکر میں تعلیم ایک اہم سیارے کی حیثیت سے جلوہ گر ہے۔ اس پر اقبالؒ کے فلسفہ خودی کا نمایاں اثر پایا جاتا ہے۔ اقبالؒ کا نظریہ تعلیم اپنی فکری غذا قرآن مجید سے بھی حاصل

کرتا ہے۔ علامہ کے زمانے میں دو طرح کے تعلیم نظام رائج تھے۔ ایک وہ جو عرصہ دراز سے دینی درسگاہوں میں نافذ تھا، جو کہ دقیانوسی اور فرسودہ خطوط پر استوار تھا، جس کا کام محض دینی تعلیم دینا تھا۔ یہ تخلیقی نہیں بلکہ تقلیدی تھا، اور کسی قسم کی تبدیلی پر مائل نہ تھا۔ دوسرا مغربی مفکر لارڈ میکالے کا بنایا ہوا الحادی فکر پر مبنی انگریزی مشنری کے لئے کلرک اور منشی پیدا کرنا تھا۔ علاوہ ازیں مسلمانانِ ہند کو ذہنی غلامی، محکومی اور فکر معاش دے کر ان کی روح قبض کرنے کی مقصد پر گامزن تھا۔ اس سازش کو ترک کرتے ہوئے "اُنھوں نے واضح طور پر کہا ہے کہ:

؎ عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے — قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش
؎ اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم — اک سازش ہے فقط دین مرت کے خلاف (۵۲)

آپ دیکھیں تو آج بھی گوروں کا چھوڑا ہوا یہ کفریہ نظام پوری آب و تاب کے ساتھ رواں دواں ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں سے سالانہ ہزاروں طلبہ ڈگریاں لے کر نکلتے ہیں، مگر وہ فکری پستی کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ شاہینی صفات سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ چہرہ روشن مگر دل تاریک ہوتا ہے۔ مادیت پرستی کے گہرے دلدل میں گر چکے ہوتے ہیں ان کا ہدف اول پیسہ کمانا ہوتا ہے، مغربی روایات اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ نوجوانوں کی اسی حالات زار پر اقبال عرض کرتے ہیں۔

؎ خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر — لعب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
؎ ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ (۵۳)

وہ ان مسائل کا ذمہ دار مغربی تعلیمی نظام کو ٹھہراتے ہیں۔ جب وہ اعلیٰ تعلیم کیلئے یورپ چلے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ مغرب کا نظام تعلیم مادی بنیادوں پر ہی استوار ہے۔ تعلیم کا مقصد محض دنیوی آسائشات سمیٹنا ہے، اور جس علم کا مقصد صرف روٹی حاصل کرنا ہو وہ سراسر موت ہے۔

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے فقط دو کف جو (۵۴)

غرض ایک نظام کا کام انتہا پسندی کو فروغ دینا جبکہ دوسرے کا کام آزاد خیالی کو پروان چڑھانا تھا۔ ان اداروں سے فارغ التحصیل طلبہ فکری جمود کا شکار تھے۔ یہاں دین اور دُنیا کی تعلیمی نظام بری طرح متاثر تھا۔ حالانکہ دین اور دُنیا کی تعلیم ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں۔ دینی تعلیم اتنی ہی ضروری ہے جتنی سائنس کی تعلیم بہرحال علامہ صاحب دونوں طرح کے نظام سے نالاں تھے۔ علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں جابجا دونوں نظاموں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا، لا الہ الا اللہ (۵۵)

مزید فرماتے ہیں:

دُنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ، کیا مدرسے والوں کی تگ و دو! (۵۵)
کرسکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
کرسکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت (۵۶)

اقبالؒ مسلمانان ہند کے لئے ایک ایسی درسگاہ قائم کرنا چاہتے تھے، جس میں قدیم اور جدید علوم کی ارتباط ہو۔ اقبالؒ چاہتے تھے کہ جدید مغربی علوم اسلام کے تابع ہوں اور وہ انسان کو مادیت کی طرف نہ لے جائیں۔ اُمت محمدیہ کا سب سے بڑا وصف تعلیم یہی ہے۔ گزشتہ چودہ برسوں میں انسان نے جو علمی ترقی کی ہے اس کی روشنی میں ختم الرسل حضرت محمد ﷺ پر پہلی وحی کے موضوع کی اہمیت اُجاگر ہوتی ہے۔ یہ وحی "اقراء" سے شروع ہوتی ہے اور خالقِ کائنات کی قدرت کے اعتراف پر ختم ہوتی ہے۔

اس آیت میں تعلیم کی غرض وغایت کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔ ہمارے لیے وہی علم لائق اعتنا ہے، جو ہمیں اپنے خالق کا شعور عطا کرے اور ہم اپنی عملی زندگی میں اس کے فرماں بردار بندے کی حیثیت سے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکیں۔ تاہم تعلیم اقبالؒ کی دلچسپی کے اہم ترین موضوعات میں سے ایک ہے، اقبالؒ نے کئی تعلیمی اداروں سے کسب فیض حاصل کیا۔

۱۸۹۹ء میں فلسفہ کے مضمون میں ایم۔اے کی ڈگری لینے سے تعلیم کا پہلا دور شروع ہوتا ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں جون ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۵ء تک فلسفہ اور انگریزی ادبیات کے اُستاد کی حیثیت سے اپنی تعلیمی قابلیت کو منواتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی اثناء میں اِن کی پہلی کتاب علم الاقتصاد متعہ شہود پر آتی ہے، رسالہ "مخزن" کے شمارہ جنوری ۱۹۰۲ء کے شمارے میں شائع شدہ مضمون "بچوں کی تعلیم وتربیت" تعلیمی حلقوں میں خصوصی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ اس مضمون میں وہ خالص نفسیاتی اُصولوں پر مبنی تعلیمی نظام اپنانے کا مشورہ دیتے ہیں جس سے بچوں میں علم سے دلچسپی پیدا ہو سکے۔

اقبالؒ نے اسی جذبہ کے زیر اثر "ہمدردی" لکھی جو ان کے مجموعہ "بانگِ درا" میں موجود ہے۔ اقبالؒ کے تعلیمی تصورات کے ارتقاء کا دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے شروع ہوتا ہے، اور ۱۹۱۴ء تک جاری رہتا ہے۔ اسی اثناء میں وہ دو تین برس یورپ کا علمی درسگاہوں سے متنوع علوم میں دستگاہ حاصل کرتے ہیں۔ اقبال کا یہ دور "اسرارِ خودی" کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۲۲ء تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصہ میں اقبالؒ کے ذہن پر خودی اور بے خودی کے تصورات چھائے ہوئے ہیں۔ یوں اِس دور میں اقبالؒ کا زور تعلیم کی نسبت تربیت پر زیادہ رہا ہے۔

اقبالؒ کا چوتھا اور آخری دور ۱۹۲۲ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۸ء یعنی ان کی وفات تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصہ میں ان کی زیادہ تر توجہ اجتہاد اور افکارِ دینی کی تعمیر نو پر ہے۔ اقبالؒ مسلمانوں کے ثقافتی سرمائے کی تعمیر نو کے بھی خواہاں ہیں۔ اسی وجہ سے ۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حامن آرنلڈ کے مرتب کردہ بی اے اور ایم اے کے نصاب کو ناقص قرار دیتے ہیں۔ نوجوانوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اقبال تعلیم نسواں پر بھی خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک تعلیم ایک عمرانی مسئلہ ہے چونکہ عورت ایک خاندان کی بنیاد ہوتی ہے۔ لہٰذا حقیقت میں یہ تمدن کی جڑ ہے۔ اقبالؒ نے عورت کے دو رُوپ خاص طور پر بیان کیے ہیں بیوی اور ماں۔ عورت کی بدولت خاندان وجود میں آتا ہے۔ خاندان سے گاؤں اور شہر وجود میں آتے ہیں۔ اور یوں ایک تمدن کی بنیاد پڑتی ہے۔ یہ تعلیم فردِ واحد کی نہیں بلکہ پورے خاندان کی تعلیم بن جاتی ہے۔

وجود زن سے ہے کائنات میں رنگ
اِسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
مکالمات افلاطون نہ لکھ سکی لیکن
اسے کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطون (۵۷)

اقبالؒ اس کی حامی ہیں کہ عورتیں زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کریں، لیکن اگر وہ اپنے اصل فرائض سے غافل ہو جائیں تو یہ اُن کے اور معاشرہ کے حق میں اچھا نہ ہو گا، ایسی عورتوں کو وہ "نازن" کہتے ہیں۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن (۵۸)
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

اقبال مخلوط نظامِ تعلیم کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے، وہ نہ صرف خواتین کے لئے الگ یونیورسٹی کے داعی تھے، بلکہ وہ لڑکیوں کے لئے علیحدہ نصاب کی ضرورت بھی محسوس کرتے تھے۔ وہ عورتوں کے نام نہاد حقوق اور مادر پدر آزادی کے خلاف تھے۔ اقبال نے اسلامی تعلیمات کی روح کو پانے کی کوشش کی ہے، اس ضمن میں ایک واقعہ کا ذکر بھی ہے۔

لندن کی مشہور دُکان (Selrige) میں خریداری کرتے ہوئے اقبالؒ کی ملاقات ایک سیل گرل سے ہوئی۔ گفتگو کے بعد اُنہوں نے اپنے ہمراہ امجد علی سے مخاطب ہو کر کہا کہ اس خاتون کو کسی کے گھر کی روشنی بننا تھا، اولاد کی صحیح تربیت کا فریضہ سر انجام دینا تھا، اس کی تخلیق کا مقصد بازار کی رونق بن جرابیں فروخت کرنا تو نہ تھا۔ ضرب کلیم میں اقبال نے اپنی نظم "عورت اور تعلیم" میں اس تعلیم کی نشاندہی کی ہے، جو عورت کو حاصل کرنی چاہیے۔

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انساں کے لئے اس کا ثمر موت

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۃ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہُنر موت (۵۹)

اقبالؒ کے نزدیک علم سے مراد کیا ہے؟ اس کا اظہار اس خط میں بخوبی ملتا ہے، جو خواجہ غلام السیدین کے نام لکھا گیا ہے، فرماتے ہیں!

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے، عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے، اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطانیت ہے، یہ علم علمِ حق کی ابتداء ہے"۔ (۶۰)

اقبال سیکولرازم کو دین و دُنیا کی تفریق کا شاخسانہ سمجھتے ہیں۔ اقبالؒ کے پسندیدہ نظام تعلیم میں عشق و عقل کے موازنے کے حوالے سے بظاہر یہ لگتا ہے کہ وہ علم کے مقابلے میں عشق کی برتری کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ علم سے مراد اقبال کے نزدیک وہ علم ہے جو شعور میں نہ سما سکے اور اس کا ادراک وجدان کے ذریعے ہو "پیامِ مشرق" کی نظم "محاورۃ علم و عشق" سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ علم کے دیو کو پایہ زنجیر کے لئے عشق کو ضروری خیال کرتے ہیں تاکہ علم کے دیو کو پایہ زنجیر کرنے کے لئے عشق کو ضروری خیال کرتے ہیں، تاکہ علم کی تار نور میں بدل جائے۔

اقبالؒ کے نزدیک علم بے عشق کے کبھی پھل پھول نہیں لا سکتا، وہ طاغوتی بن جاتا ہے لیکن علم اگر عشق کی بانہوں میں بانہیں ڈال کے چل سکے تو یہ لاہوتی ہو جاتا ہے۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں
علم با عشق است از لاہوتیاں (۶۱)

یورپ میں بہت، روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ ہے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات (۶۲)

سائنسی ترقی نے مغرب کی مادی حیثیت سے غیر معمولی طاقت بخش دی ہے، اور اُسے ظاہری شان و شوکت سے مالا مال کیا لیکن انسانیت کے اصلی جوہر کو نقصان پہنچایا، یہ علوم فنون انسان کو حقیقی راحت اور آسودگی پہنچانے کی بجائے اُس کی موت کا پروانہ بن گئے۔ انہی آثار کو دیکھ کر اقبال نے پیش گوئی کی:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا پائیدار ہوگا (۶۳)

اقبالؒ علم کے ساتھ عشق کو اس لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ انسان ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد خدا کا نائب بن جائے اور اس میں اخلاقیات پیدا ہو جائے۔ "جاوید نامہ"، مومن کی اسی اخلاقیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہر کہ او را قوت تخلیق نیست
پیش ماجز کافر و زندیق نیست (۶۴)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبالؒ نے مغربی نظام تعلیم کے چند پہلوؤں پر تنقید کی ہے، لیکن وہ علم جدید کے خلاف نہیں ہیں اس کے برعکس وہ چاہتے ہیں کہ اس علم کے حصول کا طریقہ سیکولر نہ ہو یہ علوم۔

اُردو تنقید کا مختصر پس منظر و اجمالی جائزہ:

"کسی بھی فن پارے کو اخلاقیات کے دائرے میں رہ کر علمی و فنی نقطہ نظر سے اُس کا موازنہ کرنا جانچنا تنقید کہلاتا ہے"۔ "تنقید کو انگریزی میں Guticicm عربی قواعد کی رُو سے صحیح لفظ نقد یا انعقاد ہے۔ فارسی میں تنقید رائج ہوا ہے۔ تاہم نیاز فتح پوری اور عابد علی عابد ایسے ناقدین ہیں۔ جنہوں نے تنقید کے برعکس انعقاد استعمال کیا۔

تنقید لفظ کا متبادل کے طور پر آل احمد سرور نے پرکھ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ویسے اُردو ادب میں تنقید کے معنی اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے کے ہیں۔ یہ بھی بہت دلچسپ بات کہ تنقید ادب اور ادبی تخلیقات کی تفہیم و تشریح کے لئے وقف ہے، مگر خود تنقید کی تفہیم و تشریح پر محققین اور ماہرین کا اتفاق رائے نہیں ملتا۔

بیشتر تخلیق کاروں کے ذہن میں نقاد اُس جابر سکول ماسٹر کے مترادف ہے جو کسی کو شاباش نہیں دیتا ہے۔ ایک دو اشنائی مثالوں سے قطع نظر اُردو ناقدین کی اکثریت ادبی ام کی نہیں ہے، بلکہ اکثریت اُن ناقدین کی ہے جو ہمدردانہ طور پر تخلیقات کا مطالعہ کرتے اور نیک نیتی سے ادبی پارہ کے حسن و قبح کو اُجاگر کرتے ہیں۔

"انگریزی میں اُردو کے چند بڑے ناقدین کے اسماء ایسے ہیں جن سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ نقادوں کی اکثریت تخلیق کار بھی ہے۔ ان میں ڈرائیڈن، میتھیو آرنلڈ، کولرج ورڈورتھ، ٹی ایس ایلیٹ جبکہ فرانسیسی میں ژاں پال سارتر اور اُردو میں میر تقی میر، میر حسن، مصحفیؔ، شیفتہ (یہ چاروں تذکرہ نگار) الطاف حسین حالیؔ، محمد حسین آزادؔ، شبلی نعمانیؔ، نیاز فتح پوری، فراق گورکھ پوری، عزیز احمد، محمد حسن عسکری، سلیم احمد، ڈاکٹر محمد احسن فاروق، سجاد باقر رضوی یہ محض چند نام ہی نہیں بلکہ اُردو تنقید میں فکر و نظر کے تنوع کے ضامن ہیں۔ جبکہ معاصرین سے ڈاکٹر وزیر آغا، انیس ناگی، ساقی فاروقی، شمس الرحمٰن فاروقی، علی سردار جعفری، جیلانی کامران وغیرہ جیسے بڑے بڑے نام گنوائے جاسکتے ہیں۔

"اب ہم تنقیدی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے اُردو ادب کی جانب بڑھیں گے، چونکہ اُردو لشکری زبان ہے۔ اس لئے اس کے ادب و ثقافت میں بھی عربی، فارسی اور مغربی ادب کے بھرپور اثرات موجود ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے ان زبانوں کے ادب پر نظر ثانی چیدہ چیدہ الفاظ میں کرلیں"۔

عربی تنقید کے بارے میں بات کرنے سے پہلے یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ عربی مسلمانوں کی دنی زبان ہے، لیکن ایک عرصے تک سرکاری زبان بھی رہی ہے۔ برصغیر میں عہد غزنوی میں سرکاری زبان عربی تھی۔ اس کے علاوہ عربی زبان بھی رہی ہے، کئی ایسے ممالک ہیں جن کی زبان عربی نہیں لیکن وہاں عربی زبان میں ادب تخلیق ہوا۔

ایران اور برصغیر اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ایران میں فارسی شاعری کا آغاز عربی شاعری کے زیر اثر ہوا، فارسی نثر بھی ایک عرصے تک عربی کے اثر سے آزاد نہ ہو سکی۔ فارسی تنقید کی عمارت عربی کے تنقیدی اُصولوں پر استوار ہوئی۔ اُردو شاعری کا ارتقاء فارسی شاعری کے زیر سایہ ہوا، اور اُردو کی کلاسیکی شاعری تو فارسی سے اس حد تک متاثر ہے کہ اُسے فارسی شاعری کی پرچھائیں قرار دیا گیا ہے۔ اُردو تنقید کے پیمانے بھی فارسی کے ذریعے اُردو تنقید تک پہنچے، اس لئے ان تنقیدی افکار کا سرچشمہ عربی ہے۔

مورخین ادب نے عربی ادب کے مندرجہ ذیل ادوار مقرر کئے ہیں۔

۱. دورِ جاہلیت ۴۷۵ء سے ۶۲۲
۲. دورِ خلفائے راشدین واُموی ۶۲۲ء سے ۷۵۰ء
۳. دورِ عباسی ۷۵۰ء سے ۱۲۵۸ء
۴. دورِ ترکان ۱۲۵۵ء سے ۱۷۹۸ء
۵. جدید دور ۱۷۹۸ء سے اب تک (۶۵)

تنقید ہمیشہ ادب کے ساتھ پروان چڑھتی ہے۔ چنانچہ عربی تنقید بھی ان ادار کے ساتھ ساتھ چلی ہے۔ غزنوی دور میں فارسی تنقید کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ علم بدیع میں فارسی کی پہلی تصنیف غزنوی دور کے شاعر ابو سعید احمد بن منشوری نے لکھی۔ خورشید نے اس کتاب کی شرح لکھی، محمد بن عمر رادھیانی نے "ترجمان البلاغہ" کے نام سے فارسی میں بلاغت کی کتاب لکھی ہے۔ ان سب میں عربی نمونوں کی پیروی کی گئی ہے۔ بلاغت کے یہ موضوعات فارسی کے ذریعے اُردو میں منتقل ہوئے۔

اُردو تنقید پرورش چونکہ فارسی تنقید کے زیر سایہ ہوئی اس لئے اس موضوع کے حوالے سے بھی مطالعہ ضروری ہے۔ فارسی کے جملہ اصناف شعر، قصیدہ، غزل، مثنوی، رباعی مرثیہ، مسحط، تراکیب بند، ترجیح بند، حتیٰ کہ شہر آشوب اور واسوخت بھی اُردو میں منتقل ہوئیں۔

فارسی میں تنقید کی اصلاح رائج نہیں رہی اس کی جگہ نقد کی اصلاح مشتمل ہے۔ ان معنوں میں انتقاد کا لفظ بھی دیکھنے میں آتا ہے، لیکن بہت کم نقد ادبی، اور نقد شعر کی اصطلاحیں زیادہ عام ہیں۔ فارسی میں نقد کے بارے میں کہیں کہیں اشارے مل جاتے ہیں۔

عربی تنقید کے اُصول فارسی میں آئے اور فارسی سے اُردو میں منتقل ہوئے۔ اس طرح سے اُردو تنقید کا رشتہ بالواسطہ عربی تنقید سے قائم ہو جاتا ہے۔ فارسی کے تنقیدی اشارات یکجا نہیں ملتے۔ یہ مختلف عنوانات کے تحت مختلف کتب میں پائے جاتے ہیں۔

فارسی کی طرح اُردو کے ہر دور میں بڑے شاعر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں یا کھڑے کر دیئے گئے ہیں۔ جس طرح فارسی میں شاعری کے دبستان ہیں اس طرح اُردو میں بھی ہیں۔ فارسی کے جدید نقاد قدیم تنقید کو نقدِ ذوقی قرار دیتے ہیں۔ اس کا مفہوم تاثراتی تنقید سے زیادہ قریب ہے، فارسی ادب و تنقید کے بعد ہم مختصر سا جائزہ کلاسیکی و جدید مغربی تنقید کے حوالے سے لیتے ہیں۔

کلاسیکی مغربی تنقید کا آغاز یونان اور روم سے ہوتا ہے کیونکہ بیسویں صدی کے اُردو ادب کو مغرب کے تنقیدی نظریات سے شناسائی کے بغیر ٹھیک طرح سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ خصوصاً اُردو کی موجودہ تنقید پر مغربی اثرات بہت زیادہ گہرے ہیں۔ گو کہ اُردو ادب پر اُنیسویں صدی کے انگریزی ادب کا اثر زیادہ نمایاں ہے، لیکن انگریزی ادب کے اثرات و محرکات کا سلسلہ یونانی اور روسی ادب تک جاتا ہے۔

جس چیز کو آج ہم مغربی تنقید کہتے ہیں اُس نے یونانی اور روسی ادب کی آغوش میں آنکھیں کھولیں۔ یونانی ادب میں تنقید سے قبل شاعری اور ڈرامہ اپنے نکتہ عروض پر پہنچ چکے تھے۔ شاعری میں ہومر اور اوڈیسی جیسے شاعر اور ڈرامہ نگاروں میں الیکائیلس، سوفوکلیز، یوری پیڈیز اور ارسٹوفر کے نام مقبول عام تھے۔ یونان میں تنقید کے سلسلے میں پہلا نام افلاطون کا آتا ہے اور اس کے بعد ارسطو کا۔ یونانی تنقید کے یہ دو سرمائے ایسے ہیں ان کے افکار کی وقعت اتنی زیادہ ہے کہ تقریباً ایک ہزار سال تک ادب اور شاعری کی پرکھ کے لئے انہی کے بنائے ہوئے پیمانے مستعمل رہے ہیں۔

ارسطو کے بعد یونانی تہذیب کے زوال اور رومی تہذیب کا عروج شروع ہوتا ہے۔ رومی تنقید میں ہوریس اور کوئن ٹی لین کے اسماء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح جدید مغربی تنقید کا آغاز سولہویں صدی کے نشاۃ الثانیہ کے دور سے ہوتا ہے۔ سولہویں صدی سے قبل اور ارسطو کے بعد کا زمانہ یورپ میں تاریک دور کہلاتا ہے۔

سولہویں صدی عیسوی میں یورپ میں ایک زبردست فکری انقلاب آیا اور اُس نے ہر شعبہ زندگی کو متاثر کیا۔ آج کا جدید یورپ اس نشاۃِ الثانیہ کے سہارے پر استوار ہے۔ نشاۃ الثانیہ کے ابتدائی تنقید نگاروں میں فلپ سڈنی اور جان ڈرائیڈن کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

دانتے گو کہ اپنے نظریات کے حوالے سے کلاسیکی فکر کے قریب ہے، یورپ کے تاریخ دور کے دوران ارسطو کے بعد یورپ میں دانتے کو سب سے زیادہ قبول عام ہوا اپنی تحریروں اور تنقیدی نظریات کے باوصف دانتے کی حیثیت کلاسیکی اور نوکلاسیکی ادوار کے درمیاں ایک کڑی کی مانند ہے۔ دانتے نے لاطینی زبان چھوڑ کر دیسی زبان یعنی اطالوی میں اپنے خیالات کا

اظہار کیا، یہی نظریہ آگے چل کر یورپ کے افکار کی بنیاد بنا۔ اُردو میں تنقید کے متعدد دبستان ہیں، جن میں سے ایک نام رومانی دبستان تنقید ہے۔ رومانوی تنقید اپنی کچھ خصوصیات کی بناء پر تنقید کے دیگر دبستانوں سے ممتاز اور منفرد ہے۔

"انگریزی میں اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، اور ہمارے ناقدین بھی انہی تحریروں سے استفادہ کرتے ہیں۔ رومانیت میں شعراء کا سرچشمہ قوت ابہام سمجھی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ فعال اور قوی تخیل اپنی انفرادی حیثیت میں بذاتِ خود ابہام کی سطح تک جا پہنچا ہے۔ شدتِ جذبات شاعر کے لئے محرکات کا کام کرتی ہے۔ شاعر کے لئے محرکات کا کام کرتی ہے۔ شاعری کا مقصد حصولِ مسرت ہے۔ ورڈزورتھ فطرت پرست تھا۔ رومانوی شعراء و ناقدین نے حُسن کی عکاسی پر بھی زور دیا۔ کیونکہ حسن اور اس سے وابستہ احساسات اور نفسیات انسان کی روح پر صحت مند اثرات ڈالتی رہتی ہے۔

(٦٦) "A Thing of Beauty is a Joy Forever"

اسی طرح کولرج بھی زبان کی اہمیت کا بہت زیادہ قائل تھا۔ کولرج نے نقاد کے منصب پر بطور خاص قلم اُٹھایا وہ مختلف زبانوں اور ممالک کی بہترین تخلیقات کے مطالعہ اور تقابل پر بھی زور دیتا ہے۔ اُنیسویں صدی کے وسط کے انگلستان کے لحاظ سے رومانیت کا دبستان شعر و نقد کلاسیکیت کے خلاف ردِ عمل اپنے زمانہ کا تقاضا تھا۔

آنے والے زمانے میں اس پر شدید اعتراضات بھی ہوئے۔ عمرانی، مارکسی اور نفسیاتی دبستانوں سے متعلق ناقدین نے اس پر اعتراضات کیے۔ جب اس تناظر میں رومانیت کا مطالعہ کریں تو نثر میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری کی فکشن یعنی "خیالستان" اور کیوپڈ اور سائیکی کا نام سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد حجاب امتیاز علی تاج کے افسانے اور مرزا ادیب کے صحرا نورد کے خطوط اور "صحرا نورد کے رومان" آتے ہیں۔ جبکہ شاعری میں اختر شیرانی کی "سلمٰی" اور "عذرا" ہیں۔ انہی کی بدولت وہ شاعرِ رومان کہلواتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اُردو ناقدین انگریزی کتابوں سے آراء اقتباسات اور اصطلاحات اخذ کرتے وقت انھیں اصل انگریزی متن اور سیاق و سباق سے الگ کر کے اپنے ذاتی مفہوم میں استعمال کرتے رہتے ہیں۔ جس سے غلط اثر ہوتا ہے اور تفہیم و تحقیق میں اُلجھن بھی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے تو ایک نقاد نیاز فتح پوری کو تاثراتی نقاد بتاتا ہے۔ تو دوسرا جمالیاتی اور تیسرا رومانی بظاہر یہ تینوں دبستان قریب قریب اور بعض کو مترادف نظر آتے ہیں لیکن در حقیقت تینوں کا جداگانہ دائرہ کار ہے۔ رومانیت میں چار اُمور پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔

۱. تخیل
۲. جذبہ
۳. زبان
۴. حصولِ مسرت

اگر اُردو کا کوئی نقاد ان اُصولوں کی روشنی میں ادبی تخلیقات کی تحسین و تفہیم کرے تو بلاشبہ وہ نقاد رومانوی کہلوانے کا مستحق ہو گا۔ اُردو شعراء کے تذکرے کئی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اُردو تنقید کے ابتدائی نقوش ان تذکروں ہی میں پائے جاتے ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے شعراء کے مختصر حالات ان کے کلام کا انتخاب دیا ہے اور اس پر تبصرہ کیا ہے۔ کہیں شعراء کا موازنہ کیا ہے اور کہیں محاکمے کی صورت پیدا کی ہے۔

"شعراء کے لطائف اور چٹکلے درج کئے ہیں ان کی معرکہ آرائیوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ ان سب میں تنقیدی اشارات ملتے ہیں۔ جو اپنی جگہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اُردو میں باقاعدہ تنقید کا آغاز اُنیسویں صدی کے اواخر میں انجمن پنجاب لاہور میں محمد حسین آزادؔ کے لیکچر سے ہوا"۔(٦٧)

آزاد کے بعد اُردو میں تنقید کو باضابطہ اور فکر انگیز بنانے میں حالیؔ کو مقدمہ شعر و شاعری انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور آج تک موضوع گفتگو ہے۔ حالی کے بعد شبلی نعمانی، امداد الامام اور مسعود حسین رضوی قابل ذکر نقاد ہیں۔ جنہوں نے حالی کے قائم کردہ ادبی تنقید کا دورِ اول کہہ سکتے ہیں۔ جدید اُردو تنقید کا سنجیدہ اور بطور ایک شعبہ ادب باقاعدہ آغاز ترقی پسند تحریک کے آغاز سے ہوتا ہے۔ ترقی پسند تنقید کو منوایا اور ہر دو سمت سے بہت سے نام اور نقاد سامنے آئے۔

"ترقی پسند نقادوں میں جہاں ابتدائی طور پر سید سجاد ظہیرؔ، آل احمد سرورؔ اور اختر حسین رائے پوری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ وہاں مجنوں گورکھ پوری، پروفیسر احتشام حسین، علی سرور، اداجعفری، اختر انصاری، ظہیر کاشمیری، ڈاکٹر محمد حسین، ممتاز حسین اور ڈاکٹر عبادت بریلوی وغیرہ نے ادب کو زندگی کے ساتھ جوڑ کر دیکھنے کی جس روایت کا آغاز کیا۔ ادب میں جس موضوعات کا تقاضا کیا وہ آج تک اہمیت کا حامل ہے۔(٦٨)

پاکستان میں ترقی پسند کے فروغ میں علی محمد صدیقی، ڈاکٹر عتیق احمد، ڈاکٹر آغا سہیل اور ڈاکٹر سلیم اختر کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ترقی پسند تنقید کے متوازی حلقہ اربابِ ذوق سے تعلق رکھنے والے ناقدین میں میراجی، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر وزیر آغا، جیلانی کامران اور مظفر علی سید وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

محمد حسن عسکری قیام پاکستان سے قبل ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے، لیکن بعد میں اُن کا شمار منحرفین میں ہوا۔ یوں تو اُردو تنقید نگاروں کی فہرست کافی طویل ہے۔ تاہم کلیم الدین احمد، محمد حسن عسکری، سید وقار عظیم، سید عابد علی عابد، سید عبداللہ، مظفر علی سید، سلیم احمد، فرمان فتح پوری، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید، جیلانی کامران، فتح محمد ملک، تحسین فراقی، شہزاد منظر کے علاوہ ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر بشیر وسنی اور نئی نسل کے بہت سے نقاد اس شعبے میں بڑے خلوص سے لکھ رہے ہیں۔

اُردو میں بالعموم جمالیاتی اور تاثراتی نقاد قرار پاتا ہے۔ یہ دونوں دبستان جداگانہ خصوصیات کے حامل ہیں اور ان سے وابستہ ناقدین مطالعہ ادب تخلیقات کی تحلیل میں الگ الگ طریقے استعمال کرتے ہیں۔ انگریزی میں والٹر یٹر جمالیاتی تنقید کا اہم

علمبر دار ہے۔ وہ ادب برائے ادب اور ادب برائے مسرت کا قائل تھا۔ جدید دور میں اطالوی فلاسفر کروچ کے تصور اظہاریت نے فلسفہ جمال اور جمالیاتی تنقید پر گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔

جمالیاتی تنقید کے قدیم ناقدین کے نسخوں میں "محمد حسین آزاد" کی "آب حیات" اور شبلی نعمانی کی "شہر العجم" کا اس حوالے سے نام لیا جاسکتا ہے۔ اُردو میں جمالیاتی تنقید کی بہت اچھی مثال نیاز فتح پوری کی صورت میں ملتی ہے۔ وہ جمال پرست تھے، اور یہی رویہ اُن کی عملی تنقید میں نمایاں تر ہے۔

اس کے بعد عابد علی عابد ہیں، اگرچہ مجنوں گورکھ پوری نے ایک مختصر کتاب "تاریخ جمالیات" لکھی لیکن اُنھوں نے اس نقطہ نظر سے تنقید نہیں کی ہے۔ اُن کے علاوہ بہت سی کتب جمالیاتی تنقید کے حوالے سے دیکھ میں آتی ہے۔

نیاز فتح پوری کو بیک وقت جمالیاتی اور تاثراتی نقاد کہا جاتا ہے۔ اُردو تنقید کا مطالعہ کرنے پر فراق گورکھ پوری تنقید کی کامیاب ترین مثال قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ آج کل بالعموم کتابوں کی تقریبات رونمائی، دیباچوں اور فلیپ کی صورت میں جو تنقید لکھی جارہی ہے، اُس کا شمار تاثراتی تنقید ہی ہوتا ہے۔

ان میں فکری اور فنی حوالوں سے تجرباتی مطالعہ خال خال ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ ترقی پسند تحریک اُردو ادب کی ایک ایسی تحریک ہے، جس نے ادب کی افادی پہلو پر زور دیا۔ برصغیر میں ترقی پسند ادب کی تحریک اپنے زمانہ کے لحاظ سے ایک باغیانہ متنازعہ تحریک تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تاسیس کے ربع صدی قبل ہی پریم چند ترقی پسند افسانے اور ناول قلم بند کررہے تھے گویا پریم چند ہی ترقی پسند ادب کی تحریک کے پہلے رُکن تھے۔ اُن کے بعد ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، احمد علی، مجنوں گورکھ پوری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز ساحر لُدھیانوی، کیفی اعظمیٰ، مجروع سلطان پوری، اور ادا جعفری وغیرہ ترقی پسند ادیبوں نے طنز کو کامیاب ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ کرشن چندر، سعادت حسین منٹو، کنہیالال کپور کی تحریریں اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جنھوں نے ترقی پسندی کا تصور سے وابستہ فکری اور نظریاتی بحثوں پر قلم اُٹھایا۔

ترقی پسندی جامع تصور حیات نہیں۔ اس لئے پاکستان کے مخصوص سیاسی، سماجی، اقتصادی اور عمرانی حالات کے مطابق ترقی پسندانہ مقاصد میں بھی تغیرات ہوتے رہتے ہیں، اور ہوتے رہیں گے۔ پاکستان کے تنقیدی منظرنامہ پر اس وقت نفسیاتی، ساختیاتی، عمرانی، جمالیاتی کئی دبستانوں سے وابستہ ناقدین سرگرم عمل ہیں اور ان میں ترقی پسند ناقدین بھی ہیں۔ جو اپنی انفرادی حیثیت میں اجتناعیت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اُردو میں نفسیاتی تنقید بھی اپنی خاص اہمیت کی حامل ہے۔ خاصی دیر تک میراجی کو پہلا نفسیاتی نقاد سمجھا جاتا رہا، مگر حقیقت یہ نہیں میراجی سے بہت پہلے "امراؤ جان ادا" کے مصنف مرزا ہادی رشوا کی اس انداز کی تحریریں ملتی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجوری (محاسن کلام غالب) اور وحیدالدین سلیم (افادیت سلیم) کا نام لیا جاسکتا ہے۔

ان کے بعد میرا جی کا نام آتا ہے، پاکستان میں ایسے ناقدین بھی ملتے ہیں جو کلی طور پر نفسیات سے شغف نہ رکھنے کے باوجود بعض اوقات مطالعہ ادب میں نفسیات سے کام لینے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں محمد حسن عسکری، ریاض احمد، سلیم احمد وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ یہ سب فرائڈ سے متاثر ہیں۔

بھارت میں ڈاکٹر سید محمود حسن رضوی نے "اُردو تنقید میں نفسیاتی عناصر" لکھ کر لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اُن کے مقالہ کا نام "نفسیاتی تنقید" ہے۔ "اُردو ادب میں ساختیاتی تنقید کا نظریہ نسبتاً نیا ہونے کے باوجود بھی خاصا دلچسپ ہے۔ ساخیات کے بنیادی اُصول سوئٹزر لینڈ کے ایک ماہر لسانیات فراڈی نینڈ ڈی ساسر کے مجموعہ مضمون "Course de Linguistique General" سے ماخوذ ہے"۔(۶۹)

اُردو میں ساختیاتی تنقید کا نظریہ ۱۹۸۰ء کے بعد ناقدین کی بھرپور توجہ کا مرکز بنا۔ ساختیاتی تنقید کے مطابق نقاد فن پارے کی تشریح کرنے کی بجائے اس کے لسانیاتی نظام کی ساخت کا تجزیہ کرنے کے بعد نئے معنی تخلیق کرتا ہے۔ مختصر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ساختیاتی تنقید میں تخلیق اور مصنف کے بجائے قاری یا ناقد کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یعنی اس بات سے کوئی سروکار نہیں رکھا جاتا ہے کہ تخلیق کرتے وقت تخلیق کار کے ذہن میں تخلیق کے کیا معنی تھے، بلکہ یہ ضروری امر سمجھا جاتا ہے کہ زبان کی ساخت قاری یا ناقد کو کس معانی کی طرف لے جاتی ہے، اور ناقد تخلیق سے کیا معنی اخذ کرتا ہے۔

یہی ساختیاتی تنقید کے مربوط اُصول وضوابط ہیں جن پر چلنے ولا ناقد ساختیاتی تنقید نگار کہلاتا ہے۔ اس کے علاوہ ماہرین ساختیات اس میں مزید ترمیم کی گنجائش بھی رکھتے ہیں، اور نشاندہی کرسکتے ہیں۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ دراہم میں سے کھرے کھوٹے کے فرق کو سمجھنے پر عمل کیا جائے اور تنقید جو کہ باضابطہ علم اور ادب کی روح ہے، اس کو حقیقی معنوں میں سمجھا جائے۔

کتب برائے حوالہ جات:

۱. اشاراتِ تنقید (ڈاکٹر سید عبداللہ)
۲. تنقید کیا ہے (آل احمد سرور)
۳. تنقیدی دبستان (ڈاکٹر سلیم اختر)
۴. آب حیات (مولانا محمد حسین آزاد)

اُردو زبان تاریخ کے آئینے میں:

"اُردو زبان کے آغاز وارتقاء کے بارے میں متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اُردو زبان کی ماہیت اس کے ترکیبی عناصر برصغیر پاک وہند میں مسلم، غیر مسلم اقوام کی آمد اور مقامی زبان وثقافت کے اثرات وغیرہ شامل ہیں"۔

اُردو ہے جس کا نام ہم جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے (۷۰)

اُردو لسانیات کا بحیثیت مجموعی مطالعہ کرنے پر یہ امر واضح ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ زور زبان کی پیدائش پر دیا جاتا ہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ قوموں اور نسلوں کے معدوم ہونے کے ساتھ ان کی عمارت کی مانند اُن کی زبانیں بھی آثار قدیمہ میں شمار ہوئیں۔ ہم اُردو، ہندی، تامل، تلنگو، مراٹھی وغیرہ صرف چند معروف زبانوں کے نام سے آشنا ہیں۔ جبکہ برصغیر میں چھوٹی بولیوں اور بڑی بولیوں کی تعداد اگر ہزاروں تک نہیں تو سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اس لسانی تنوع کا سب سے بڑا سبب اس خطہ کی وسعت ہے۔

آج برصغیر تین ممالک میں منقسم ہے۔ جس میں مختلف اوقات میں مختلف زبانیں بولنے والی اقوام اور نسلیں آکر آباد ہوتی رہیں۔ یہاں آباد ہونے والے گروہ اور اقوام اور متنوع نسلیں اپنی ثقافت، اساطیر، رسمیں، لباسِ خوراک اور زبانیں بھی ساتھ لائی۔ اگرچی کچھ عرصہ کی بودوباش کے بعد اس خطہ کی ہو کر رہ گئیں۔ لیکن اُن کی زبان، ثقافت، اور اساطیر کے قومی عناصر نے اپنا تشخص برقرار رکھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بظاہر یک رنگی کے باوجود اختلافات نے جنم لیا۔

"لسانی اور ثقافتی تنوع کے لحاظ سے برصغیر پاک وہند منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ جب چار ساڑھے چار ہزار برس قبل آریہ وسطی یورپ سے نکلے اور پنجاب میں وارد ہوئے تو انہوں نے پہلے سے آباد راوڈ، کول وغیرہ نسلوں سے شمالی ہند کا خطہ خالی کرالیا"۔(۷۱)

دراوڑوں نے جنوب کا سفر اختیار کیا اور کچھ بلوچستان میں جابسے۔ ہندوستان میں صوبوں سے تہذیبی، ثقافتی اور لسانی عوامل کا تال میل جاری تھا کہ مسلمانوں نے اس خطہ کا رُخ کیا۔ مگر دیگر اقوام کی مانند مسلمان صرف ایک طرف ہی سے ہندوستان وارد نہیں ہوئے بلکہ تین اطرف سے یعنی شمال (پنجاب)، مغرب (سندھ) اور جنوب (ہند کا مغربی ساحل) پنجاب اور سندھ پر مسلمان حملہ آور ہوئے۔

قابض ہوئے اور حکومت کی جبکہ جنوبی ہند سے عربوں کے تجارتی روابط قبل اسلام ہی سے تھے۔ ہندوستان میں آنے والی اقوام اور مسلمانوں کی آمد میں خاصا فرق ہے۔ دیگر اقوام بت پرست تھیں اور ان کی مخصوص اساطیر تھیں، جبکہ مسلمان توحید پرست تھے۔ ان کا مذہب ہی جداگانہ نہ تھا، بلکہ زبان، لباس، رسوم ورواجات اور ثقافت بھی منفرد تھی۔

مسلمانوں میں دو زبانیں بولنے والے شامل تھے۔ عربی اور فارسی، عربی کیونکہ مذہبی زبان بھی تھی، اسی لیے فارسی کو عربی سے نابلد نہ ہوئے تھے۔ فعلں کی آمد سے ترکی زبان کا بھی اضافہ ہوگیا۔ ادھر زبان میں متعدد مقامی بولیاں اور زبانیں رائج تھیں۔ ادھر مسلمان مزید زبانیں لے آئے۔ یہ ایسی زبانیں تھیں جو انفرادی حیثیت میں غیر اہم نہ تھیں بلکہ یہ بڑی زبانوں میں شمار ہوتی تھیں۔ یوں ان تمام زبانوں کے تال میل نے زبان کی وہ "حلیم" تیار کردی جس نے "اُردو" کا نام پایا۔

اسلام تبلیغی مذہب ہے مسلمانوں نے دُنیا کے ہر خطہ میں دین اسلام پھیلایا تو وہ تلوار کے برعکس میٹھی زبان سے تھا۔ ہندوستان میں کثیر تعداد میں صوفیاء کرام آئے شمال سے لے کر جنوب تک مشرق سے مغرب تک۔ وہ تمام ہندوستان میں پھیل گئے۔ بدلے ہوئے سیاسی حالات کے باوجود آج بھی ہندوستان کے ہر حصے میں صوفیاء کرام کے محققین نے بھی تسلیم کیا ہے۔

اس ضمن میں مولوی عبدالحق کی تالیف "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاء کرام کا کام" (کراچی ۱۹۵۳ء) خاص اہمیت کی حامل ہے۔ میر امن اگرچہ ماہر لسانیات نہ تھے، نہ ہی اُردو زبان سے وابستہ نظریہ سازی کی تاریخ میں اُن کا کوئی اہم مقام ہے۔ مگر "باغ و بہار" کے دیباچہ میں اُنہوں نے اُردو زبان کے آغاز کے بارے میں جو کچھ لکھا اس سے صرف نہیں نظر نہیں کیا جا سکتا۔

اقتباس کا آغاز اس معنی خیز فقرے سے ہے۔ "حقیقت اُردو کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے کہ دلی شہر ہندوؤں کے نزدیک ہو چکی ہے"۔ انہیں کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاشا بولتے تھے، ہزاروں برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا"۔(۷۲)

سلطان محمود آیا، پھر غوری اور لودھی بادشاہ ہوئے۔ اس آمدورفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی ہے۔ آخر امیر تیمور نے (جن کے گھرانے میں اب تک نام نہاد سلطنت کا نام چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ اس کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر کا بازار اُردو کہلایا۔ اگر دلی جدی ہے، وہ پرانا شہر کہلاتا ہے، اور وہاں کے بازار کو اُردو معلےٰ کا خطاب دیا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ میر امن کے زمانہ میں یہ تصور عام ہو گا، کہ فعل لشکر میں مختلف قوموں کے باہمی میل ملاپ کے نتیجہ میں ایسی بولی نے جنم لے لیا۔ جس میں ہر زبان کے الفاظ کی آمیزش اور لہجوں کا امتزاج کا تعین بھی ہوتا ہے۔

اُردو ایسی زبان ہے جو عوامی ضروریات کے لئے اُردو کے عوامی تقاضوں کی تکمیل کے لئے عوام نے وضع کی۔ اُردو زبان میں لشکر کے لئے اُردو استعمال ہوتا ہے۔ شہنشاہ اکبر کے عہد میں زبان کی ساخت کے جس عمل کا آغاز ہوا۔ شاہ جہاں کے عہد تک وہ واضح صورت اختیار کر جاتا ہے۔ گلی محلے کے ساتھ ساتھ اُردو شاہی دربار اور محلات تک بھی جا پہنچی ورنہ شاہ جہاں اسے "اُردو معلیٰ" نہ کہتا۔ بعض ماہرین نے اُردو کے آغاز کی داستان کی کڑیاں صدیاں پیچھے جا کر تلاش کیں۔

جنہوں نے مخصوص علاقہ سے اُردو زبان کا آغاز ثابت کیا اس ضمن میں تین نظریات ملتے ہیں۔

۱. "پنجاب میں اُردو" (حافظ محمود شیرانی)
۲. "دکن میں اُردو" (نصیر الدین ہاشمی)
۳. "سندھ میں اُردو" (سید سلیمان ندوی، نقوشِ سلیمانی)

یہ نظریات اُردو لسانیات میں خصوصی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ کسی بھی زبان کے آغاز، صورت پذیری اور پھر تخلیقات سے وابستہ امور کے سلسلے میں یہ اساسی حقیقت ملحوظ رہے۔ کہ زبان خلاء میں تشکیل نہیں ہوتی۔ انسانی معاشرہ اسے پیدا کرتا ہے، اور اس معاشرے کے پھیلنے پھولنے کے ساتھ یہ پھلتی پھولتی اور ان کی ذہنی صلاحیتوں کے تناسب سے اس میں بھی تخلیقات ہوتی ہیں۔

اُردو نثر کا ارتقائی جائزہ:

اُردو زبان کے تشکیلی دور میں ابتدائی شعری نمونوں کے ساتھ ساتھ نثر کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ تاہم اُردو نثر کا باقاعدہ آغاز مُلا وجہی کی "سب رس" سے سمجھا جاتا ہے۔ اُردو زبان کی تشکیل اور ابتدائی شعری نمونوں کے مطالعہ کے ضمن میں گجری اور دکنی کے تذکروں میں بھی نثر کا حوالہ ملتا ہے۔ چنانچہ جنوبی ہند میں نثر کی اولین کتاب کے سلسلہ میں نصیر الدین ہاشمی کا یہ قول نقل کیا گیا تھا کہ:

"حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سید محمد حسین المتوفی ۸۲۵ھ وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے دکنی نثر کی ابتداء کی"۔ (۷۳) (بحوالہ دکن میں اُردو، ص ۴۱)

نصیر الدین ہاشمی نے ان کی یہ کتابیں لکھی ہیں۔ "معراج العاشقین"، "ہدایت نامہ"، "تلاوت الوجود"، "شکار نامہ"، "سہ بارہ"، یہ سارے رسالے علم تصوف میں لکھے گئے ہیں۔ افسوس کہ ان رسائل کے زمانہ تصنیف کا صحیح علم نہیں، لیکن یہ ۸۱۵ھ، ۸۲۵ھ کے درمیانی زمانہ کی تصانیف قرار دی جاسکتی ہیں۔

عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:

"نبی کہے تحقیق خدا کے درمیاں تے ستر پردے اور جیالے کے ہور اندھیار کے اگر اس میں تے یک پردہ اُٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں"۔(۷۴)

(معراج العاشقین بحوالہ دکن میں اُردو، ص:۵۱)

ملا وجہی کی "سبارس" ۱۶۳۶ء ادبی نثر کا دلکش نمونہ ہے، جو اسلوب کی جمالیات کے لحاظ سے آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاسکتی ہے۔ "سب رس" سے پہلے وجہی نے تصوف پر ایک رسالہ بھی قلم بند کیا۔

بقول وجہی:

"یو رسالہ ایک دریا ہے۔ ہر ورق ایک موج ہے ہر بات جیوں مانک موتی" (۷۵)

سب رس، تمثیلی قصہ ہے، اس کا موضوع اخلاقی نکات اُجاگر کرنا ہے، مگر بات رمزیہ انداز اور شاعرانی اسلوب میں کی گئی ہے۔ یہ فارسی کے مشہور قصہ "حسن و دل" کا اُردو روپ ہے۔ شمالی ہند میں اُردو نثر کی پہلی کتاب فضل علی فضلی کی "کربل کتھا"۔

فضلی کے بقول:

"کمال الدین حسین بن علی الواعظ کی مشہور کتاب روضۃ الشہداء کا اُردو روپ ہے"۔(۷۶)

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کہتے ہیں:

"کربل کتھا" لسانی اعتبار سے بڑی اہم کتاب ہے۔ ابھی تک ہمارے سامنے شمالی ہند کی نثر کا کوئی بڑا نمونہ نہیں تھا"۔ (۷۷)

"باغ و بہار" اگرچہ نصابی ضرورت کے لئے ترجمہ کرائی گئی، لیکن میر امن کے خوبصورت اسلوب نے اسے تخلیقی نثر کی کتاب بنادیا۔ اسی لیے دو صدیوں سے باغ و بہار نے ناقدین سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ آج ہم جس اُردو نثر سے آشنا ہیں یہ اپنے کٹھن ارتقائی مراحل سے گزر کر ہمارے سامنے اپنے جدید اسلوب کے ساتھ موجود ہے۔

حوالہ کتب:

"وجہی سے عبدالحق تک" ڈاکٹر سید عبداللہ، "سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی اُردو نثر کا فکری جائزہ" ڈاکٹر سید عبداللہ

اُردو غزل کا آغاز:

غزل اُردو شاعری کی مقبول صنفِ سخن ہے اسے ہر دور میں قبول عام حاصل رہا ہے۔ حسن و عشق کے بنیادی موضوع کے باوصف اس میں مذہب، فلسفہ، تصوف، اخلاقیات، حیات و لمحات دیگر موضوعات کا اظہار ہوتا رہا ہے۔

غزل کی ابتداء دکن میں ہوئی اور ولی دکنی اُردو کا پہلا شاعر ہے، انھیں اُردو شاعری کا باوا آدم بھی کہا گیا ہے۔ مگر تاریخی تاریخی طور پر یہ درست نہیں، کیونکہ ولی سے پہلے بھی غزل کی روایت ملتی ہے۔ بہر حال اس کے باوجود ولی کی اہمیت برقرار دی جاتی ہیں۔

ہر ایک صنفِ سخن کا اپنا لہجہ، آہنگ اور انداز ہے لیکن جو مقبولیت صنفِ غزل کو حاصل ہوئی وہ کسی اور صنف کو میسر نہیں اِسے ولی اور سراج کے دور میں بھی قبولِ عام کا درجہ حاصل رہا۔ غالبؔ و داغ کے زمانے میں بھی یہ سرخرو ہی اقبال و حسرت کے عہد میں بھی یہ اپنی عظمت کا ڈنکا بجاتی رہے اور آج کی اٹامک انرجی کے دور میں بھی اس کا حُسن و جمال ماند نہیں پڑا ہے۔

جہاں تک غزل کے معنی کی بات ہے تو اس کے لغوی معنی عورتوں کے متعلق باتیں کرنا ہے۔ بادی النظر میں غزل عورتوں کے حسن و جمال کے اظہار اور عشق و محبت کی واردات کے تذکرے کا نام ہے۔ لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ یہ صنفِ سخن کسی بھی دور میں اپنے لغوی معنی میں محدود ہو کر نہیں رہی۔ اگر بغور جائزہ لیا جائے تو غزل کے ہر شعر میں ایک دُنیائے معنی پنہاں نظر آئے گی۔ مذہب، فلسفہ، تصوف، اخلاقیات، حیات و ممات، سیاسیات، معاشرت و معیشت غرضیکہ زندگی کے گوناگوں حالات وواقعات دو مصرعوں میں متحرک دکھائی دیں گے۔

غزل کا ہر شعر ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے، اور اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے۔ دو مصرعوں میں جذبات ومشاہدات کا سمندر موجزن ہوتا ہے۔ اُردو غزل گوئی کا رواج چونکہ فارسی غزل کے ہیں۔ تاہم شعرائے اُردو نے ملکی عناصر بھی اپنی غزلوں میں داخل کیے ہیں۔ چنانچہ تشبیہات، استعارات اور تلمیحات میں مقامی اثر بھی ملتا ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اُردو کا پہلا کلیات مرتب کیا۔ جس میں بکثرت غزلیں موجود ہیں۔ ولیؔ دکنی دِلی آنا اُردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ ایک طرف تو ولی نے اپنی دکنی اُردو کو دلی کی ٹکسالی اُردو میں ڈھالا، دوسرے ان کے کلام کی مقبولیت کو دیکھ کر دلی کے فارسی گو شعراء اُردو میں غزل کہنے لگے۔ اس عہد کے جو شعراء ولیؔ سے متاثر ہوئے ان میں آبروؔ، ناجی، مضمون، یکرنگ، آرزو اور شاہ حاتم جیسی شخصیات شامل ہیں۔ اشرف علی فغاںؔ اور مرزا مظہر جانجاں کے نام بھی اس دور میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس دور کے چند شعراء کے اشعار درج ذیل ہیں۔

زندگی دردِ سر ہوئی حاتم
کب ملے گا مجھے پیا میرا (۷۸)

(شاہ حاتمؔ)

قول آبرو کا تھا نہ جاؤں گا اس گلی
ہو کر کے بے قرار دیکھو آج پھر گیا (۷۹)

(شاہ مبارک آبروؔ)

یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کو
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا (۸۰)

(ولیؔ دکنی)

اُردو غزل کے دوسرے دور میں میرؔ، سودا، اور دردؔ جیسے باکمال شعراء پیدا ہوئے۔ ان سبھی نے اُردو غزل کو ابہام گوئی اور لفظی گورکھ دھندوں سے پاک کیا، زبان صفائی اور انداز بیاں کی خوبی اس عہد کی نمایاں خصوصیت ہے۔ میر کو

"خدائے سخن" کے لقب سے نوازا گیا۔ وہیں درد کا کلام "تصوف" اخلاق اور درد و اثر سے مملو ہے۔ وہ چھوٹی بحر کے بادشاہ سمجھے جاتے ہیں۔

اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں ممتاز غزل گو سامنے آئے ان میں امیر اللہ تسلیمؔ، امیر مینائی، داغؔ، جلالؔ، رشکؔ، اور الطاف حسین حالیؔ ہیں۔ داغؔ اپنے زمانے کے بڑے غزل گو شاعر تھے۔ حالی جدید شاعری کے پیش رو ہیں۔ حالی کے بعد فنِ غزل گوئی کو توانائی علامہ اقبال نے عطا کی۔

حسرت موہانیؔ نے اپنی غزلوں میں حسن و عشق کی دلکش ترجمانی کی ہے۔ اصغر گونڈوی کے کلام میں صفائی بھی ہے، اور انہوں نے تصوف کے موضوع کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ جگرؔ کے یہاں انفرادی سرمستی ہے۔ آرزوؔ لکھنوی نے خالص اُردو کے نمونے غزل کے ذریعے پیش کیے۔ فراقؔ نے غزل کے موضوعات اور اندازِ بیاں میں نئی وسعتیں پیدا کیں۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا (۸۱)

پاکستانی غزل کے اس دور میں جو شعراء غزل کی حیثیت سے اُفق شاعری پر نمودار ہوئے۔ ان میں احمد فراز، شہزاد احمد، ظفر اقبالؔ، منیر نیازی، شکیب جلالیؔ، باقی صدیقی، افتخار عارف، پروین شاکرؔ، زہرہ نگاہ سلیم احمدؔ، سیفی وغیرہ اپنے فکر و فن کی بدولت ایک امتیازی مقام کے مالک ہیں۔ سائنسی دور میں اُردو غزل نے سیاسیات، معاشیات، عمرانیات، فلسفہ، تہذیب و اقدار کے مختلف شعبوں کے مسائل کو بھی اُجاگر کرنا شروع کر دیا ہے۔

گویا غزل گوئی کی تاریخ بڑی جاندار ہے۔ اُردو کے نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد نے جسے "نیم وحشی صنفِ سخن" قرار دیا تھا، وہ اُردو زبان و ادب کا جھومر ہے۔ جس کی اہمیت ہر گزرتے دور میں بڑھتی نظر آتی ہے، اور اس نے اپن دامن کو ہمیشہ وسیع تر رکھا ہے، اور ہر دور کے تقاضوں کو اپنے دامن میں جگہ دی، یوں ہم اس کے آغاز سے لے کر آج موجودہ دور تک اُسی آب و تاب کے ساتھ نکھرتا سنورتا اور پھلتا پھولتا دیکھتے ہیں۔

سر سید احمد خان سید تھے۔ اگر سید تھے تو خان کیوں؟

"سر سید احمد خان نام سر خطاب تھا۔ ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء (۵ ذوالحجہ ۱۲۳۲ھ) کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہء نسب امام نہم امام محمد تقیؑ تک پہنچتا ہے۔ اس لئے وہ تقوی سید کہلاتے تھے" (۸۲)

سر سید کے بزرگ شاہجہان کے عہد میں ہندوستان آئے اور ان کا تعلق ہمیشہ دربار سے رہا۔ سر سید کے دادا جان ان کا گھرانہ علم و فضل، رشد و ہدایت اور حسب نسب کے لحاظ سے ہمیشہ ممتاز رہا۔ سر سید کے دادا جان فارسی کے شاعر تھے، اور سر سید کے قول کے مطابق ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان سر سید کے والد سید متقی کی بھی مغلیہ دربار میں بڑی رسائی تھی۔ مولانا حالی نے "حیاتِ جاوید" میں سر سید کے حوالے سے لکھا کہ سر سید کہتے تھے۔۔۔۔

"میں بارہا اپنے والد کے ساتھ اور پھر تنہا بھی اس خاص دربار میں گیا ہوں" (۸۳)

سر سید کے ننھیال کا تعلق میر درد کے خاندان سے تھا۔ ان کے نانا خواجہ فرید الدین احمد، خواجہ محمد یوسف ہمدانی کی اولاد میں سے تھے۔ غرض ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے سر سید نجیب الطرفین اور خاندانی تھے۔ مولف نورخ یگانہ حضرت الحاج مولانا سید نجم الحسن کربلائی، ناظمِ اعلیٰ پاکستان مجلسِ علماء۔

علماء نے لکھا ہے کہ حضرت امام تقیؑ کی چند بیویاں تھیں، جن میں اُم الفضل بنت مامون رشید عباسی اور سمانہ خاتون یاسر بھی نمایاں حیثیت رکھتی تھیں۔

جناب سمانہ خاتون جو کہ حضرت عمار یاسر (رضوان اللہ علیہ) کی نسل سے تھیں، کے علاوہ کسی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ آپ کی اولاد کے بارے میں علماء کا اتفاق ہے کہ دو نرینہ اور دو غیر نرینہ تھیں۔ جن کے اسماء یہ ہیں۔ (۱) حضرت امام علی تقیؑ (۲) حضرت جناب موسیٰ مبرقعؑ (۳) حضرت جناب فاطمہ رضی اللہ عنہ (۴) جناب امامہ۔

امام نہم امامت کا سلسلہ امام دہم حضرت علی نقیؑ سے آگے چلا۔ وہ سادات نقوی ہیں جبکہ علماء اس بات پہ متفق رائے رکھتے ہیں اور تمام مکتوبات کی چھان بین کرنے کے بعد یہ پتا چلتا ہے کہ ہشتم امام علی رضاؑ کی صرف ایک نرینہ اولاد ہوئی جو نہم امام محمد تقیؑ ہیں۔ لہٰذا جو امام نہم کی نسل آگے بڑی وہ تقوی سید نہیں بلکہ اپنے دادا امام ہشتم کے نسب سے دُنیا میں آباد ہیں اور رضوی سادات کہلاتے ہیں۔

صالحہ عابد حسین۔ تاریخ ولادت اور خاندان:

سید احمد خان ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ بمطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ وہ باپ کی طرف سے حُسینی سید ہیں۔ اُن کا سلسلہ نسب ۳۲ واسطوں سے آنحضرت تک پہنچتا ہے، اور جیسا کہ شجرہ نسب مندرجہ خطباتِ احمدیہ سے پایا جاتا ہے۔ اُن کے سلسلہ نسب میں سے آخری امام محمد تقی ابنِ موسیٰ رضاؑ ہیں، اور اسی لئے وہ اپنے تئیں تقوی سید کہتے تھے۔

جس زمانے میں کہ بنی اُمیہ اور بنو عباس کے ظلم و ستم سے عرب اور عراق میں رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ اور اس لیے اکثر سادات کے خاندان وطن چھوڑ کر دُور دراز ملکوں میں جا رہے تھے، اُسی پر آشوب زمانے میں کسی وقت سر سید کے اجداد بھی دامغان میں جو ایران کا قدیم مشہور شہر ہے، چلے آئے اور آخر کار سہراب میں انہوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ غالباً اُن کے بزرگ ہندوستاں میں پہلے پہل شاہجہان کے عہد میں آئے تھے، اور اُس وقت سے لے کر اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک اُن کو اس سلسلہ عالیہ کے ساتھ برابر کسی نہ کسی طرح تعلق رہا ہے۔

سر سید کے ننھیال کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ "سیرت فریدیہ ہیں"۔ جو خود سر سید نے اپنے نانا خواجہ فرید الدین احمد کے حالات میں لکھی ہے، درج ہے۔ یہاں ہم اس کا خلاصہ ایک یادداشت سے جو سر سید نے "سیرت فریدیہ" لکھنے سے پہلے لکھوائی تھی، اخذ کر کے لکھتے ہیں:

"سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد جو خواجہ محمد یوسف ہمدانی کی اولاد میں ہیں۔ سرسید کی والدہ خواجہ فرید کی تینوں بیٹیوں میں سے بڑی تھیں۔ اُن میں قدرتی قابلیت دیگر عورتوں سے بہت زیادہ تھی، وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور ابتداء میں کچھ فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ مگر اولاد کی تربیت کا اُن میں خداداد ملکہ تھا"۔(۸۴)

سرسید کہتے تھے کہ:

"میرے تمام ننھیال کو شاہ عبدالعزیز اور اُن کے خاندان سے عقیدت تھی، مگر میری والدہ کو شاہ غلام علی صاحب سے بیعت اور عقیدت تھی۔ شاہ صاحب کے ہاں منت اور نذرونیاک کہیں پتانہ تھا۔ اُن کی عادت تھی کہ جب کوئی حاجت کی غرض سے پانی لے جاتا تو سب حاضرین سے کہتے کہ دُعا کرو خدا اس کی حاجت پوری کرے یہی عقیدہ میری والدہ کا تھا"۔(۸۵)

سرسید مزید کہتے تھے کہ:

"اُس زمانہ میں جبکہ میرے مذہبی خیالات اپنی ذاتی تحقیق پر مبنی ہیں۔ اب بھی میں اپنی والدہ کے عقائد میں کوئی ایسا عقیدہ جس پر شرک یا بدعت کا اطلاق ہو سکے، نہیں پاتا۔ البتہ وہ یہ سمجھتی تھیں کہ قرآن پڑھ کر بخشنے کا یا فاتحہ دلا کر کھانا تقسیم کرنے کا ثواب مُردہ کو پہنچتا ہے۔ مگر میں اِن دونوں باتوں کا قائل نہیں ہوں۔ عبادت بدنی میں تو میں نیابت مطلق کا قائل نہیں، اور عیادت مالی میں بھی سوا اس کے متوفی اپنی زندگی میں کچھ مال کسی کارِ خیر کے لئے کسی کے سپرد کر جانے اور کسی صورت میں نیابت کا قائل نہیں ہوں"(۸۶)

سرسید کا بچپن:

سرسید کے پیدا ہونے سے پہلے اُن کی بہن صفیہ النساء بیگم اور اُن کے بھائی سید محمد خان پیدا ہو چکے تھے۔

۱۔ سید محمد خان کی ولادت کے بعد چھ برس تک اُن کے والدین کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے سید احمد خان کے پیدا ہونے کی اُن کو نہایت خوشی ہوئی۔

۲۔ اِسی طرح تمام شواہد کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ باپ کی طرف سے "سید" تھے، جبکہ وہ نجیب الطرفین سید نہیں تھے۔ البتہ نجیب الطرفین خاندانی تھے۔

۳۔ تاریخ شاہد ہے کہ سادات پر جس طرح ظلم ہوئے، اور انہوں نے اپنے نام اور نسل کی بقاء کے لئے جو اقدامات کیے۔ اُن میں ایک ہجرت اور دوسرا اپنا مسلک اور عقائد چھپا کر رہنا تھا۔ اگر سرسید بھی انہی عقائد کے پیروکار ہوتے تو اُن کا نام آج "سرسید احمد خان" کی بجائے "سرسید احمد رضوی" لکھا اور پکارا جاتا۔

حوالہ جات

۱. www.premnathbismil.com

۲. ایضاً

۳. jang.com.pk

۴. ایضاً

۵. ایضاً

۶. ایضاً

۷. ایضاً

۸. m.faceboo.com

۹. ایضاً

۱۰. www.currentschoolnews.com

۱۱. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳: ص ۲۷

۱۲. ایضاً

۱۳. ایضاً

۱۴. ایضاً، ص: ۲۸

۱۵. ایضاً

۱۶. ایضاً

۱۷. ایضاً، ص: ۲۹

۱۸. ایضاً

۱۹. ایضاً

۲۰. ایضاً

۲۱. www.rekhta.org

۲۲. ایضاً

۲۳. ایضاً

۲۴. ایضاً

۲۵. ایضاً

۲۶. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص: ۳۰

۲۷. ایضاً

۲۸. ایضاً

۲۹. ایضاً

۳۰. www.rekhta.org

۳۱. ایضاً

۳۲. ایضاً

۳۳. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳ء ص: ۳۱

۳۴. ایضاً

۳۵. ایضاً

۳۶. ایضاً، ص: ۳۲

۳۷. ایضاً

۳۸. ایضاً

۳۹. ایضاً، ص: ۳۳

۴۰. ایضاً

۴۱. ایضاً

۴۲. ایضاً، ص: ۳۴

۴۳. ایضاً، ص: ۳۵

۴۴. ایضاً

۴۵. ایضاً

۴۶. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳ء، ص: ۳۶

۴۷. ایضاً

۴۸. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳ء، ص: ۳۶

۴۹. ایضاً

۵۰. ایضاً

۵۱. www.humsub.com.pk

۵۲. ایضاً

۵۳. ایضاً

۵۴. ایضاً

۵۵. ایضاً

۵۶. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳ء ص:۴۰

۵۷. ایضاً، ص:۴۱

۵۸. ایضاً

۵۹. ایضاً

۶۰. ایضاً، ص:۴۲

۶۱. ایضاً

۶۲. ur.m.wikipedia.org

۶۳. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳ء ص:۴۰

۶۴. ایضاً، ص:۴۴

۶۵. ایضاً، ص:۴۸

۶۶. ایضاً، ص:۴۹

۶۷. ایضاً، ص:۵۰

۶۸. ایضاً، ص:۵۳

۶۹. ایضاً، ص:۵۴

۷۰. ایضاً

۷۱. ایضاً

۷۲. ایضاً، ص:۵۸

۷۳. ایضاً

۷۴. ایضاً، ص:۵۹

۷۵. ایضاً

۷۶. ایضاً

۷۷. ایضاً،ص:۶۵

۷۸. ایضاً

۷۹. ایضاً

۸۰. ایضاً،ص:۶۶

۸۱. ایضاً،ص:۶۹

۸۲. ایضاً

۸۳. ایضاً،ص:۷۱

۸۴. ایضاً،ص:۷۲

باب سوم

ادبی کالم

کالم نگاری کیا ہے؟

کالم نگاری نہ ادب و شاعری ہے، نہ تقریر و خطابت کا نام ہے۔ اور نہ سیاست کا، بلکہ یہ حکایت و داستاں سرائی ہے۔ یہ بیک وقت صحافت و ادب بھی ہے اور شاعری بھی۔ کالم نگاری داستاں گوئی ہے۔ یہاں تک کہ وہ تقریر و خطابت کی شعلہ سامانی کو اپنے دامن وسیع میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ کالم نگار کا قلم بھی شعلے برساتا ہے، اور کبھی شبنم تو کبھی معاشرے کے ناسور پر نشتر لگاتا ہے، اور کبھی دلوں پر مرہم بھی رکھتا ہے۔

کالم یا کالم نویسی فرانسیسی لفظ (Columa) اور لاطینی زبان کے لفظ (Colomne) سے ماخوذ ہے۔ جس کے معانی (کھمبا یا ستون) کے ہیں۔ اخبار نویسی کے اس فن کی ابتداء جنگ اول کے آخری وقتوں میں ہوئی۔ کالم اخباری زبان کی قدروں کی شناخت کرتا ہے۔ جتنی اچھی (خبر) ہوتی اتنا ہی کالم اچھا ہو گا اور اچھی خبر کی بنیاد حقیقت میں پانچ ڈبلیوز (Why, What, When, Where, Who) اور تھوڑا بہت حصہ How کا بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح اُردو میں لفظ (ک) ہے۔ یعنی (کیا، کون، کب، کہاں، کیوں) شامل ہیں۔

کالم نویس کسی واقع، حادثے وغیرہ کو اپنی علمی استعداد اور مشاہدے کے ذریعے کالم میں زیر تحریر لاتا ہے۔ کالم کہانی یا مضمون سے ہٹ کر ایسی الگ صنف ہے، جس میں معلومات، اسلوب، بیانیہ اور ادائیگی سے ہٹ کر ایک چیز "تحقیق" شامل ہوتی ہے۔ صحافتی اصطلاح میں کالم ایسی تحریر کو کہتے ہیں جس میں موجودہ حالات و واقعات (Current Issues) پر دلائل سے اظہار خیال کیا جائے۔

عطاء الحق قاسمی کے بقول:

"کالم ایک تحریری کارٹون ہوتا ہے، جس میں کالم نویس الفاظ سے خاکہ تیار کرتا ہے"۔(۱)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کالم کس طرح لکھا جائے کہ وہ مضموں یا پھر کہانی سے ایک الگ پہچان لیے کالم کی ہی صنف میں اس کے مکمل لوازمات کے ساتھ نظر آئے۔۔۔ اس کے لیے ہمیں سب سے پہلے کالم اور مضمون کا بنیادی فرق سمجھنا ہو گا۔

کالم نگاری کی اقسام:

کالم نگاری کا کینوس خاصا وسیع ہے، لیکن برطانیہ کے نامور صحافی اسٹیورٹ جان کے نزدیک بنیادی اقسام درج ذیل ہیں۔ جن سے مزید کئی شاخیں نکلتی ہیں۔

۱. اسلوبی قسم
۲. موضوعاتی قسم

۳. مشاہداتی کالم

۴. کالم نگار کی ذمہ داری

۵. کالم نگاری کا دائرہ کار

کالم لکھنے کے مقاصد:

سب سے پہلے ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم کالم لکھنا چاہ رہے ہیں تو اس کے پیچھے کون سے عوامل ہیں۔ ہمارا مقصد عوام کی اصلاح ہے۔ معلومات بہم پہنچانا ہے یا محض ہم اپنی مشہوری کے لئے کسی بھی خبر کی تشریح کے ساتھ کالم نگاری کی دُنیا میں وارد ہونا چاہتے ہیں۔ جب انسان کا مقصد واضح ہو جاتا ہے تو اس کے لیے آئندہ کے راستے ہموار ہو جاتے ہیں۔

کالم کس موضوع پر لکھا جائے؟

"کالم لکھنے کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے۔ اس کے لیے کسی بھی موضوع کو چنا جا سکتا ہے، لیکن ایک اچھا کالم وہی ہوتا ہے جو حالات حاضرہ کے موضوع پر کچھ اس طرح سے لکھا گیا ہو کہ اسے جس دور میں بھی پڑھا جائے وہ اُسی دور کی عکاسی کرتا ہو۔ اس حوالے سے منو بھائی، حسرت موہانی، اور جدید دور کے کالم نگار ندیم پراچہ، اور جاوید نقوی کے کالمز ہیں جو سدا بہار ہیں"۔(۲)

کالم کا اسلوب:

کالم نگاری کی زبان اور اسلوب سادہ مگر پر اثر ہونا چاہیے، اگر اس میں ادب کی چاشنی ہو جائے تو کیا بات ہے۔ ہمارے یہاں یہ ہے کہ کالم کو محض ایک خبر کی تفصیل کے زمرے میں ڈال دیا گیا ہے۔ اس کی اصل نبض پر ہاتھ رکھنا کسی ماہر کالم نگار کا ہی کام ہے۔ اس کے لیے معلومات کی ترسیل کو اس انداز سے پہنچانا اہم ہے جو دل پر اثر انداز ہو۔

"جو تحریر دل سے لکھی جاتی ہے وہی پُر اثر ہوتی ہے۔ ایک تو خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ اس میں زیادہ محنت اور تردد نہیں کرنا پڑتا۔ محض اپنے موضوع سے متعلق معلومات اکٹھی کیں۔ ان پر ضروری ریسرچ اور مصدقہ و مستند کی مہر ثبت کروائی اور اپنے ایک خاص انداز سے لکھ کر عوام کے ہاتھوں میں پہنچا دیا۔ پھر آپ کا وہ منفرد انداز آپ کی پہچان بن جاتا ہے"۔(۳)

کالم نگار معاشرے میں وجود پذیر ہونے والے نظریات و تحریکات کا بالا ستعیاب مشاہدہ کراتا ہے۔ کالم نگار اگر ظالم و مظلوم، حاکم و محکوم کے لیے تازیانہ ہے تو وہیں معاشرے کے مجبور و بے کس کے لیے شمع فروزاں بھی ہیں۔ کالم نگاری صحافت کے دائرے میں بھی آتی ہے۔

اسی طرح معظمہ نقوی نے اپنی تحریروں میں معاشرے کے تمام حالات کو اپنی قلم سے گزارتی ہیں۔ کالم نگاری کا دائرہ کار اور دائرہ عمل اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ اس کی سماجی و سیاسی، تہذیبی و تمدنی، اخلاقی اور ہمہ گیر وسعت اور معنویت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اس کے اعتراف میں اکبر الہ آبادی یوں گویا ہیں۔

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو (۴)

کالم نگاری میں معظمہ نقوی نے وقت کی قدر و قیمت کو سامنے رکھ۔ وہ غیر ضروری طوالت، لفاظی اور افسانوی انداز سے اجتناب کرتی ہیں۔ اُن کے کالم میں دیئے گئے مواد کا تسلسل کی قیمت جدا نہیں ہوتا۔ بلکہ انھوں نے انا سے بالاتر ہو کر ملک و قوم کی بہتری کے لیے لکھا ہے۔

میں کیوں لکھتی ہوں۔۔۔۔؟

میں نے جب سے لکھنا سیکھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا (۵)

جب سے انسان نے ہوش سنبھالا۔ پڑھنے، لکھنے کا سلسلہ تب سے چلا آرہا ہے۔ شعور یعنی کہ انسان کو باشعور ہونے کے لیے پڑھنا، لکھنا اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے انسان کے خیالات جو کہ تھم، جم جاتے ہیں۔ اُن کی آگاہی کی اہمیت کا اندازہ ہمایر سب سے مقدس کتاب کی نازل ہونے والی پہلی آیت مبارکہ "اقراء باسم" سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ مولائے کائنات نے فرمایا:

"کلام کرو تاکہ پہچانے جاؤ" (۶)

(نہج البلاغہ: ۳۹۲)

کلام صرف زبان و بیان کا نام نہیں ہے، بلکہ قلم کے ذریعے فکر کو خیالات کو آشکار کرنا ولیوں کا شیوہ رہا ہے۔ لکھنا کوئی فن نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ ہے۔ یہ ہنر اگر آسان ہوتا تو دُنیا کا ہر شخص ہی ماہر قلمکار ہوتا۔

معظمہ نقوی کے بقول:

"جب میری حقیرانہ ہستی، نا سمجھی سے شعور کی دُنیا میں داخل ہوئی تو اپنی کچھ ناتواں سی آرزوں، اپنی محسوسات کو ڈائری پہ رقم کرنا میری عادت بن گئی۔ پھر اس ڈائری کو کوئی پڑھ نہ لے اِسے کپڑوں میں چھپا چھپا کر رکھتی اور جب کبھی وہ ڈائری امیّ ابوّ کے ہاتھ لگ جاتی تو میں غصہ میں آکر اس کو جلا دیتی۔ یوں ہر سال میں کئی ڈائریاں لیتی، لکھتی اور ان کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی۔ میں نے دیگر لڑکیوں کی طرح کبھی مہنگے کپڑوں، جیولری، دوست بنانا، ہنگامہ گھومنا، پھرنا ان سب کے نہ خواب دیکھے اور نہ کوئی شوق پالا"۔ (۷)

میں ہمیشہ پین (قلم) لینے، ڈائری لینے کا خواب دیکھتی اپنا زیادہ تر وقت تنہا گزارتی۔ جس پر ابو جی سے خاص طور پر ڈانٹ ملتی۔ اور کہتے۔۔۔ آدم بیزار مت بنو۔۔۔ اپنی محسوسات کو لفظوں کے ذریعے کاغذ پر ہی رقم کرتی۔

جب کبھی میری سینئر کو میرے جنون کا علم ہوتا تو وہ یہی کہتی۔ ہاں وقتی شوق ہوتے ہیں یہ ڈائری کے بھی تم بھی بھول جاؤ گی یہ سب۔۔۔۔۔ اُن کے یہ الفاظ مجھے تیر بن کر لگے، اور کئی کئی دن میں اسی کرب میں رہتی اور دُعا کرتی۔ یا اللہ مجھے کاغذ قلم سے بے پناہ عقیدت ہے۔ خدایا مجھ سے یہ سب کبھی مت چھیننا یہ میری قوت گویائی ہے۔ وہ کہتی ہیں:

"پھر زندگی کے تلخ لمحے بھی آئے وقت کے بے رحم ہاتھوں کی چپیڑیں جب میری روح کے رُخساروں پر پڑیں تو میں نے اپنے درد کو لفظوں کی زبان دینا شروع کی۔ نہ جانے کب اور کس وقت میرے لکھے نے مجھے باادب بننے کی لائن میں کھڑا کر دیا اور آج میں صرف اس سوچ سے لکھ رہی ہوں کہ خود کو اس اہل بنالوں کہ ادب کے سمندر میں ایک قطرہ بن کر ضم ہو جاؤں"۔(۸)

"بس یہی ایک خواہش اب بے حساب ہے"۔(۹)

معظمہ نقوی اپنے لکھنے کے سفر میں گہرائی میں جا کر لکھتی ہیں اور معاشرے کے سب مسائل کو اپنی تحریروں کا حصہ بناتی ہیں۔ کیونکہ اُن کو یہ شوق بچپن سے تھا۔ اس لئے اُن کا لکھنا گہرائی میں جانا یہ سب اُن کے بس کی بات ہے، اور شوق ہے۔ اس لیے اُن کے کالمز میں ادبی رنگ جھلکتا ہے۔ کیونکہ اُن کو یہ شوق وراثت میں بھی ملا اس لیے اُن کی زیادہ تر توجہ لکھنے میں ہی صرف رہی ہے۔

اُنھوں نے اپنے کالمز میں معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں اور بگاڑ کو بیان کیا ہے۔ جس میں معاشرہ اس قدر ڈوب رہا ہے کہ اُن کو

مصنوعی محبت:

آج کے اس مصروف ترین دور میں جہاں زندگی سیکنڈز کی رفتار سے طے کر رہی ہے۔ سوشل میڈیا نے دُنیا کو ایک دوسرے کے بہت نزدیک کر دیا ہے۔ تیز گام ریل میں سفر کے دوران ساری دُنیا سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب آگئی ہے۔ وہیں قریب ترین رہنے والوں سے دوری کی بڑی وجہ بھی بن گئی ہے۔ احساس کم ہو گی اہے۔ جذبہ دل ختم ہو گیا ہے۔ اس نفسی دُنیا کے عالم میں جس چیز کی شدت ملتی ہے وہ مصنوعی محبت کا وجود ہے۔ اپنے رشتوں سے ناخوش "ایک رشتے کو صحیح سے نبھائے بغیر نئے رشتے کی جستجو آج کے دور کے ہر آدمی کا خاصہ بن چکی ہے۔ یہ صرف آج کی نوجوان کال المیہ نہیں بلکہ اس میں شامل ہر عمر اور نسل کے لوگ ہیں جنھوں نے محض محبت کو جنسی ضرورت پوری کرنے کے لیے استعمال کیا ہوا ہے، اور یہ خیالات کس قدر کیف ہیں کہ انسان کے جذبوں کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے"۔(۱۰)

آدمی وضع قطع اور چال ڈھال کے مختلف طریقوں سے اپنے اُوپر اُڑھ لے۔ لیکن اصل ایمان تو وہ ہے جو دل کی بھی لذت دے اور جس کے پیچھے چلنے میں مزہ بھی آئے اسی لیے نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جن چیزوں سے ایمان کی مٹھاس حاصل ہوتی ہے ان میں سے ایک یہ ہے۔

" ان یکون اللہ والرسول احب الیہ ممن سواہ علیھم"

"اللہ اور اس کے رسول ان دو کے علاوہ ہر چیز سے زیادہ پیارے اور محبوب ہو جائیں جب یہ کیفیت ہوتی ہے تب ہی ایمان دل میں اُترتا ہے۔ ایمان کا مزہ ملتا ہے اور ایمان میں لذت آتی ہے"۔(۱۱)

آدمی دل کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ محبت کی راہ میں کسی کو دھکا نہیں دینا پڑتا ہے کہ جاؤ اس کے کوچے میں جاؤ جو محبوب ہے۔ اس کی گلی میں جاؤ اس کے دروازے پر جاؤ اس کو یاد کرو اس کا نام لکھو یہ سب سبق کسی پڑھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ محبت خود ہی اُستادوں میں سے بڑی اُستاد ہے۔ سکھانے والوں اور قوتوں میں سب سے بڑی قوت ہے یہ انسانوں کے دل فتح کر لیتی ہے۔ محبت مصنوعی ذرائع سے پیدا نہیں کی جاسکتی؟

قتلِ عمد

قتل عمد کی تعریف:

"قتل عمد کی تعریف یہ ہے کہ مجنی علیہ قتل کے ادارے سی کسی جان لینے والے فعل کا ارتکاب کرے۔ یعنی فعل جس سے موت واقع ہوتی ہے۔ صرف مجرم کام اس فعل کا ارادہ کافی نہیں ہے بلکہ اس کو قتل عمد قرار دینے کے لیے یہ بھی ضروری ہے، کہ اس نے قتل کا بھی قصد کیا ہو اور اگر اس کا ارادہ محض زیادتی کا تھا تو وہ قتل عمد نہیں ہے"۔(۱۲)

اگرچہ اس سے مجنی علیہ کی موت واقع ہو جائے بلکہ وہ فقہاء شریعت کی تصریح کے مطابق شبہ عمد اور مروجہ قوانین کے ماہرین کی تعبیر کے لحاظ سے موت پر منتج ہونے والی ضرب ہے۔

قرآن سنت میں قتل عمد کی حرمت:

قرآن وسنت میں بہت سی نصوص ایسی ہیں جو کہ قتل عمد کی حرمت پر دلالت کرتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ: "اور جس جان کی اللہ نے حرمت رکھی ہے اُسے ناحق قتل نہ کرو اور جو مظلوم ہو کر مارا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو قابو دیا ہے، تو وہ وارث قتل کا بدلہ لینے میں حد سے نہ بڑھ۔ بیشک اس کی مدد ہوتی ہے"۔(۱۳)

(سورۃ بنی اسرائیل آیت:۳۳)

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے:

ترجمہ: "اے ایمان والو تم پر فرض ہے کہ جو ناحق مارے جائیں ان کے خون کا بدلہ لو آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت تو جس کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی ہوئی تو بھلائی سے تقاضا ہو اور اچھی طرح ادا یہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارا بوجھ ہلکا کرنا ہے اور تم پر رحمت تو اس کے بعد جو زیادتی کرے اس کے لیے دردناک عذاب ہے"۔(۱۴)

(سورۃ البقرۃ آیت:۱۷۸)

احساس اور آدمیت کے جذبے کی بناء پر بندوں کو دوسری جنسوں پر برتی دی گئی اور یہی جذبہ ہی حقانیت کی آواز بنتا ہے اور قرب الٰہی کا موجب بھی۔ اسی جذب کے زیر اثر معاشرے میں فلاح و اصلاح کی فکر وجود میں آتی ہے، اور جدا جدا طرف پر اس کو عملی شکل دی جاتی ہے ان میں سے ایک عمل معالج طبقہ کا ہے جو اپنے آپ کو کار خیر کی بنیادی اکائی گردانتے ہیں اور ہو بھی سکتے ہیں۔ مگر خلوصِ نیت شرط اولین ہے کیوں نہ ہو جب "عملوں کا دارومدار ہی نیتوں پر ہے"۔(۱۵)

معظمہ نقوی کہتی ہیں کہ:

"آج کے اس مردہ آدمیت کے دور میں شاذونادر ہی ایسی صفات کا معالج آپ کو ملے گا جس میں خلقِ خدا کی خدمت کا جذبہ ہو۔ دُنیا بٹورنے کے چکر میں اور اپنا معیار زندگی بلند رکھنے کی چاہ نے انہیں اس قدر اندھا بنا ڈالا کہ شب و روز کی الگ الگ نشستوں کے معالجہ کی رقم بھی منفرد کی گئی ہے، اور رقم کی ادائیگی کے بعد ہی ان کو معالج کی دو منٹ شکل دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کا خاص نمائندہ ہی ان کے اس فعل کو انجام دیتا ہے۔ گائینی ہسپتال جو اب بیوٹی پارلر کی طرح ہر محلے میں سہولت سے موجود ہیں۔ مگر یہاں صرف پیسہ ہی بولتا ہے، آنکھوں دیکھا حال آپ کو آج سنانے چلی ہوں"۔(۱۶)

"اک چھ ماں کی حاملہ لڑکی جو کمزور طبیعت ہونے کے باعث دیوار کا آسرا کبھی اپنی ماں کا سہارا لے کر انتظار گاہ تک پہنچی وہ معمول کا معائنہ کروانے گھر سے نکلتی تھی۔ شین ڈاکٹروں کی کلینک پر گئی، مگر سب کو موجود نہ پا کر آخر ش مشہور و معروف کلینک پر پہنچی۔ پیاس سے نڈھال تھی وہاں پر موجود پانی والے کولر کی حالت اندر کی باہر والی سے بھی بدتر تھی۔ اس میں اگر کسی جانور کو پانی پلانا پڑ جاتا بھی اس کی صفائی کا خیال رکھا جاتا ٹوائیلٹ کی بدبو سے اسے متلی ہونے لگی وہ اک لمحہ یہاں بیٹھ نہ پائی اور دیوار کا سہارا لے کر باہر کی گیلری میں ٹھہر گئی۔

پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر آپریشن تھیٹر میں ہے۔ اس کے بعد وہ آدھا گھنٹہ آرام کریں گی پھر نماز کا وقفہ ہو گا، اور اس کے بعد انہوں نے آنا ہوا تو آئیں گی ورنہ نہیں۔ یہ سب سن کر اس نے ملتمی انداز سے نرس سے کہا! سسٹر بات سُنیں آپ براہ مہربانی ڈاکٹر سے پوچھ لیں ہم دور سے آئے ہوئے ہیں اس نے دلاسہ دیا اور چلی گئی۔ اسی دوران دو اور عورتیں بھی اس کی

شریک راہ ہو گئیں۔ پانچ منٹ کے بعد وہ نرس واپس آ کر اعلانیہ انداز سے بولی جس جس نے اپنا معائنہ کروانا ہے وہ ڈبل فیس پر کروا سکتا ہے۔ اور ادویات بھی ہمارے ہی سٹور سے ملیں گی۔ ایک ہزار روپے معالج کی فیس اور سٹور کی دوائی تین ہزار ٹوٹل جمع کروادیں اگر منظور ہے تو بیٹھیں ورنہ چلے جائیں۔ یہ سُن کر اس پہ تو سکتہ طاری ہو گیا، کیونکہ ان کے پاس اُس وقت کل ایک ہزار تھا۔ اس کی والدہ نے آگے بڑھ کر نرس سے بات کی کہ ہمارے پاس رقم کم ہے۔ ہم ادویات کل لے جائیں گے۔ آپ مہربانی کر کے صرف چیک اپ کروادیں مگر وہ پتھر کی طرح ٹس سے مس نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اتنا بھی اُسے کہا کہ ہمارا شناختی کارڈ بطور امانت رکھ لو، ہم کل آ کر لے جائیں گے۔ مگر وہ نہ مانی اور ہر بار کہتی رہی تم لوگ کل آ جانا۔ اور وہ بیچاری دو گھنٹے یہاں پر بھی تکلیف سہنے کے بعد خالی واپس چلی گئی۔ وہ درد سے کراہ رہی تھی، ٹھہرنے کے باعث اُس کے پاؤں پر سوزش ہو چکی تھی اور نہ جانے اس پر آگے کیا گزری ہو گی۔

معظمہ نقوی کہتی ہیں کہ یہ سارا تماشا دیکھنے کے بعد میرا دل و دماغ غم و غصے میں ڈوب گیا اور کئی سوالوں نے میرے دل و دماغ کے اندر ارتعاش پیدا کر دیا۔ ستر ہزار ایک آپریشن کی فیس اور چھ ہزار دو مریضوں سے لے کر جیب میں رکھنے والی ڈاکٹر کی باقی دن کی کمائی تو گنتی نہ کریں۔ اگر صرف ایک مریض آج فری چیک کر لیتی تو کیا جرم ہو جاتا، کیا کمی آ جاتی۔ کیا یہی خدمت خلق ہے۔ اس لڑکی کے ساتھ اگر کچھ برا ہو گیا تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ قتل عمد ہے؟ اور قاتل سرعام متعبر بن کر پھرتے ہیں۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

"مسلمانوں کا قتل حسین حالتوں کے سوا جائز نہیں ہے۔ ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا ہو، احصان کے بعد زنا کیا ہو، بلاوجہ کسی کو قتل کیا ہو"۔(۱۷)

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

"ایک مومن کا قتل خدا کے نزدیک پوری دُنیا کے ختم ہونے کے مترادف ہے"۔

(۱۸)

سنتِ رسول ﷺ سے یہ ثابت ہوا کہ جس شخص نے کسی مومن کو مظلومانہ قتل کر دیا وہ اس کے قصاص میں قتل کیا جائے گا، سوائے اس کہ ولی مقتول راضی ہو جائے۔

عاشور کا دن گر نہ ہوتا

عاشورہ:

"عاشورہ یا یوم عاشورہ السامی تقویم کے مہینے محرم الحرام کے دسویں دن کو کہا جاتا ہے۔ اس دن شعیہ مسلمانوں کی اکثریت اور کچھ سُنی مسلمان پیغمبر اسلام محمد ﷺ کے نواسے حسین ابن علی کی شہادت کو مختلف طریقوں سے یاد کرتے ہیں"۔(۱۹)

شہادت کے واقعہ پر کسی قسم کا اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اہل سنت اور اہل تشیع دونوں متفق ہیں۔ واقع کربلا کے تقریباً فوری بعد ہی نوحہ گری شروع ہوگئی تھی۔ واقعہ کربلا کی یاد میں اموی اور عباسی دور میں مشہور مرثیے تحریم کیے گئے اور ابتدائی ترین عزاداری سنہ ۹۶۳ء میں بویہ سلطنت کے دور میں ہوئی۔

افغانستان، ایران، عراق، لبنان، آذربائیجان، بحرین، بھارت اور پاکستان میں اس دن عام تعطیل ہوتی ہے۔ اور کئی دوسری نسلی و مذہبی برادریاں اس دن جلوس میں شریک ہوتی ہیں۔

کسی صیاد کی پڑ جانے نہ چڑیا پہ نظر
آپ سرکائیں نہ محرم سے دوپٹہ اپنا (۲۰)
کسی کا کوئی مرجائے ہمارے گھر میں ماتم ہے
غرض بارہ مہینے تیس دین ہم کو محرم ہے (۲۱)
عشق اب بھی ہے محرم بیگانہ نما
حسن یوں لاکھ چھپے لاکھ نمایاں ہوجائے (۲۲)

تاریخِ انسانی ہزار صدیوں پرانی ہے۔ ہر دور نے زندگی گزارنے کے لیے مختلف اقدار کو متعارف کروایا۔ لیکن ان تمام ادوار میں حقانیت کی تعلیم مسلسل جاری رہی، جو کہ برگزیدہ بندوں نے سرانجام دی وہ برگزیدہ بندے رب کے بھیجے گئے خاص نبی، پیغمبر اور رسول ﷺ ہیں۔ جن کی تعداد کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی گئی ہے۔ اس سلسلہ نبوت کی آخری کڑی سرکارِ دو عالم ختم المرتبت سید المرسلین آقا حضرت محمد ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ کے دُنیا سے پردہ کر جانے کے بعد ضرورت اس بات کی تھی کہ رب کی حقانیت کا بول بالا ہمیشہ قائم رہے، اور رب کی طرف سے دی گئی تعلیمات کے مطابق ہی لوگ اپنی زندگیاں بسر کرتے رہیں۔

یہ دُنیا ہمیشہ قائم رہنے والی نہیں ایک دن اس پوری دُنیا کو ختم ہونا ہے۔ حلال اور حرام میں تمیز قائم رکھیں۔ اور اپنی وجہ تخلیق کو سمجھیں کہ ہم کس لیے پیدا کیے گئے۔ اس دُنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے۔ یہ سب باتیں ہمیں ذہن میں رکھنی ہیں۔

یہ نہیں کہ جانوروں کی طرح زندگی بسر ہو نہ دُنیا کا پتا ہو نہ آخرت کا ایسے ہی اس دُنیا میں آئیں، کھائیں، پیئیں اور دُنیا کی اس پنتی میں ڈوب کر ہی مر جائیں۔

"تمام امور کے لیے صرف قرآنی تعلیمات ہی کافی نہ تھیں۔ تبھی اللہ پاک نے اہل بیت اطہارؑ کا وجود اپنا حق بندگی میرے بتائے گئے اُصول وضوابط میں رہ کر ادا کر سکیں، اور اشرف المخلوقات کہلانے کے لائق بن سکیں"۔(۲۳)

آدمیت کے وجود نے ازل سے ہی حق و باطل کا وجود جنم دے دیا تھا۔ جس نے نیکی بدی کی راہ مقرر کر دی۔ بعد سرکارِ کائنات ﷺ جہاں دینِ نبوی میں بے حساب تبدیلیاں لائی گئیں۔ وہاں اہل بیت اطہارؑ کے اوپر بے شمار مظالم ڈھائے گئے۔ ان کی عزت و تکریم بھلا دی گئی۔ جن کی مودت کے بغیر دینِ اسلام پر اعتقاد رکھنے والے کا ایمان کبھی مکمل نہیں ہوتا اور اس کا نتیجہ ۶۱ سنہ ھجری کو واضح طور پر سامنے آ گیا۔

جب یزید ابن معاویہ بر سر اقتدار آیا، اس نے سوالِ بیعت سردار جنت آقا وارث دین محمد ﷺ سے کیا۔ جن کے لیے آقائے دوجہاں ﷺ نے کبھی خود کو سواری بنایا تو کبھی ان کی پشت پر آ جانے سے اسے اپنے سجدوں کو طول دے دی اور بارہا فرمایا:

"الحسینؑ ومنی وانا من الحسین"(۲۴)

وارثِ انبیاؑء کے انکار پر انہیں اپنے تمام اہل وعیال سمیت جلاوطن کر دیا گیا۔ ان پر کئی مظالم ڈھائے گئے ان کے پورے خاندان کر دیا گیا۔ دوران حج امام دوجہاں مولا حسینؑ کو شہید کر دینے کا ارادہ کیا گیا۔ خدا کی حرمت اور تقدس کو آپ نے بچایا۔ آپ نے اپنے اہل وعیال جس میں معصوم بچے بھی شامل تھے لیکر عراق روانہ ہوئے۔

یزیدی فوج نے آکر آپ کا محاصرہ کر لیا، دس محرم روزِ عاشورہ تمام مظالم کی حد ختم کر دی گئی۔ آپ نے کئی قربانیاں دینِ نبوی ﷺ کی حرمت واستقامت تا ابد قائم رکھنے کے لیے پیش کیں۔ اس میں نوے سال ضعیف صحابی بھی تھا اور چھ ماہ لا شیر خوار بیٹا بھی۔ اگر یہ جنگ ہوتی تو محض ہار جیت پہ ہوتی۔ اور اصول وضوابط کے مطابق ہوتی۔ مگر یہ محض جنگ کی شکل دے کر نسل کشی پیغمبر تھی۔ اور بعد عاشورہ اگر یہ جنگ ہوتی تو وہ سپاہ یزید سب کو قتل کر کے جیت چکی تھی۔ پھر بنی زادیوں کو قیدی بنا کر سروں سے ردائیں چھین کر شہر بہ شہر بازاروں اور درباروں میں پھرانا کون سے مذہب میں یہ قانون آج تک ملتا۔۔۔؟ عورتوں ار بچوں کی عزت و تکریم ہر حال میں رکھی جاتی ہے، اگر عاشور کا دن نہ ہوتا تو دُنیا حق و باطل کی تمیز ہی نہ کر پاتی۔ ہر طرف بدی ہی بدی ہوتی۔ حلال و حرام کا پتا بھی نہ ہوتا، حق آج بھی سربلند ہے چاہے باطل نے جتنا اس کو دبایا۔

سستی شہرت:

"شہرت اور بڑا نام حاصل کرنا ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کو یہ سب ورثے میں مل جاتے ہیں، اور کچھ لوگ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اسے کمانے کے لیے انتھک محنت اور جدوجہد کرتے ہیں"۔(۲۵)

موجودہ دور میں اپنی قابلیت کے بل بوتے پر عزت اور نام کمانے میں میڈیا بہت اہم کردار ادار کرتا ہے۔ آپ اپنے کسی بھی فن کا مظاہرہ کریں اور ایک ویڈیو بنا کے معاشرتی رابطے کی کسی بھی ویب سائٹ پر ڈال دیں۔ بہت جلد لوگ آپ کی قابلیت سے واقف ہو جاتے ہیں، اور آپ عزت اور شہرت حاصل کر سکتے ہیں۔

لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ کچھ لوگ جنہیں سستی شہرت کا شوق ہوتا ہے، وہ نازیبا اور اخلاقیات سے گری ہوئی حرکتیں کر کے ویڈیوز بناتے ہیں اور انہیں خود سر عام لاتے ہیں تا کہ انہیں زیر بحث لایا جائے۔

حال ہی میں کچھ مشہور!

یوں تو ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے، اور کسی دوسرے کو یہ حق نہیں حاصل کہ وہ کسی بھی دوسرے شخص کی کسی بھی حرکت پر تنقید کرے لیکن اس طرح کی نازیبا حرکتیں دُنکا کے سامنے ہمارے معاشرے کا جو عکس پیش کرتی ہیں۔ اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس عمل کی مذمت کرنی چاہیے۔ میرا لکھنے کا فقدان شخصیات پر تنقید کرنا نہیں ہے۔ ہاں البتہ میں اس رویے کی پُر زور مذمت کرتی ہوں۔ میرے نزدیک سستی شہرت کے شوقین لوگوں کے لیے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی، کہ ان کی نازیبا حرکات معاشرے پر کیا اثرات مرتب کرتی ہیں۔

سستی شہرت حاصل کرنے کوچوں میں چوباروں میں
کھوٹے سکے اچھلے اچھے پھرتے ہیں بازاروں میں (۲۶)

ہیں کچھ ایسے لوگ جو اپنے پیسوں سے چھپواتے ہیں
اوروں کے کاندھوں پہ چڑھ کر تصویریں اخباروں میں (۲۷)

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس طرح کے غیر اخلاقی رویوں کے بڑھتے ہوئے رُجحان کی بنیادی وجہ کسی بھی قسم کی قانونی چارہ جوئی نہ ہونا ہے۔ میں اس بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ ہمارے معاشرے میں چند غیر مناسب رویوں کو کچھ زیادہ برا نہیں مانا جاتا۔ کیونکہ ہماری ذاتی زندگی پر ان کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا، مگر بحیثیت قوم دُنیا کے سامنے ہمارا جو عکس پیش کیا جاتا ہے، ہم اس کے حقدار نہیں۔

آج کے مصروف ترین دور میں جہاں ہر شخص کی اپنی الگ دُنیا ہے، وہاں وہ خود پرستی کی بیماری میں بھی بُری طرح مبتلا ہے۔ سوشل میڈیا کے اس دور نے آدمی سے نہ صرف اس کی آدمیت چھین لی، بلکہ اُسے حیوان صفت درندہ بنا ڈالا ہے۔

معظمہ نقوی کے مطابق:

"المیہ ادب میں یہ ہوا یہاں بھی مچھلی منڈی کی طرح اوباء و شعراء کی لمبی فہرست تو موجود ہے، مگر ان میں کوئی لوئس الیگزینڈر، نپولین، سعدی، رومی، شیرازی، علی شریفی، سرسید، اقبال، جوش، نصیر ترابی، فیض و دیگر کار فرما۔ جنہوں نے آدمیت

کو بیدار کرنے میں اپنا کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ سوائے چند جن کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ یہاں کی صورت حال بھی معاشرے سے قدرے جدا نظر نہیں آتی"۔(۲۸)

اس شہرت پرستی کی غرض نے ہی تو مشاہیر اور قلم چھاپوں کی منڈی لگادی ہے، اور گھر بیٹھے، چلتے، پھرتے طوائف پیدا کر دیئے۔ اسی سستی شہرت نے ہی آدمیت کو ناثمر دہ کر ڈالا۔ شاید غالب نے اس لیے فرمایا تھا کہ:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا (۲۹)

میرے خیال سے ہر شخص کو عزت اور نام کمانے کے لیے مثبت راستہ چننا چاہیے۔ کوئی ایسا عمل کرنا چاہیے جس پر آپ قوم کا فخر بنیں، تاکہ لوگ اپنی پہچان کے لیے آپ کا نام پسند کریں۔ نہ کہ ایسے مختصر اور تیز طریقے اپنائیں جو آپ کی تربیت پر سوالیہ نشان بن جائیں۔

ادب کی خستہ حالی

ادب کے معنی:

ادب عربی زبان کا لفظ ہے، اور مختلف النوع مفہوم کا حامل ہے۔ اس کے لفظی معنی قاعدہ، قرینہ، طریقہ، عجز و یاز، حیا، شرو خاکساری کے ہیں۔

لغوی معنی:

"ادب کے لغوی معنی کسی چیز کو حدِ نگاہ میں رکھنا جبکہ اصلاح میں اس سے مراد زبان و بیان کا علم ہے۔ جس میں علوم و فنون، قدریں اور اصنافِ سخن شامل ہیں۔

"ادب کی تعریف ہر زبان کے مورخ اور دانش مندوں نے اپنی زبان میں کی ہے۔ دُنیا میں بے شمار زبانیں بولی جاتی ہیں"۔(۳۰)

ہر زبان کی اپنی تہذیب و ثقافت، رسم و رواج ہیں لیکن اپنی پہچان اور شناخت کو قائم رکھنے کے لیے ماضی اور حال کے تمام فنون اور علوم کو وہاں کے مورخ، دانشور، شاعر، ادیب اپنے رنگ میں محفوظ رکھتے ہیں۔ پرانے وقتوں سے جب سے عقل آدمی میں شعور آیا تو ادب کا وجود بھی وقوع پذیر ہو گیا۔ ہر گزرتے دور کے ساتھ اس میں اُتار چڑھاؤ آتے رہے۔ مگر جتنا ادب کے ادنر دھاندلی اور غیر معیاری کام اکیسویں صدی میں ہو رہا ہے، ایسا شاید پہلے کبھی نہیں ہوا۔

برائلر شاعر و ادیبوں کی بھرمار ہے۔ ایک ہی علاقے میں ہر محلے میں نئی ادبی تنظیم ہے۔ جبکہ وہاں صرف منافقت اور تخریب کاری کا اجتماع ہوتا ہے۔ بینک، دفاتر، تعلیمی اداروں میں مرد حضرات کا اپنی کولیگ خواتین پر آپس میں جملے کسنا ان کو

اپنی گفتگو کا موضوع بنانا اپنے نام کے ساتھ منسوب کر کے باتین کرنا، کیا یہ اخلاقیات و ادب کی حدود ہیں؟ اور یہ کس ادب کی ترویج کے لیے کام ہو رہا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دُنیا میں جتنے انقلاب رونما ہوئے اُن میں ادباء و شعراء نے خدمات سرانجام دیں۔

کہاں چین سے آج دُنیا میں کوئی
یہ جنت بنادی گئی ہے جہنم
نہ گزرا کبھی ایک لمحہ سکوں سے
محبت میں آئے وہ دن رات پیہم (۳۱)

(انور شعور)

جب ایک شاعر، ادیب اہل قلم اور معاشرے کی اصلاح و فلاح کا دعویدار رہی۔ معاشرے میں پھیلی بے راہ روی اور جنسی میلانات کا مرتکب ملتا ہے۔ پھر بھلا وہ اس کی روک تھام کے اسباب کہاں سے پیدا کرے گا؟ اور کیا قلم کی حرمت کا وہ امیں ہے، جو اپنی حرمت نہ بچا سکے، اور حلال و حرام کی تمیز تک نہ کر سکے۔ وہ آدمی کے روپ میں حیوانوں سے بھی بدتر مخلوق ہے۔ ایسے دانشور و اور ادیبوں سے کیسے انقلاب کی توقع رکھی جا سکتی ہے؟ عقل حیران ہے۔

کرونائی دور اور ادب:

"دُنیا میں بے شمار مخلوقات آباد ہیں، ان کی سکونت کا عمل صدیوں پر محیط ہے۔ ان تمام مخلوقات میں اشرف المخلوقات ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے حساس مخلوق حضرتِ انسان ہے"۔(۳۲)

۲۰۱۹ء کے اواخر میں کرونا وائرس نامی بیماری سے پہلا متاثرہ شخص چین کے شہر ووہان میں رونما ہوا۔ اس بیماری کو کووڈ ۱۹ کا نام دیا گیا۔ یہ بیماری پوری دُنیا میں پھیل گئی۔ دُنیا میں ہر طرف خوف طاری ہو گیا۔ مرض کی شدت تقریباً اڑھائی برس کی طویل مدت تک رہی ہے۔ تاحال یہ موجود ضرور ہے مگر اس کی بھیانک صورتحال پر قابو پالیا گیا تھا۔

وباء کے باعث ساری دُنیا کا نظام اور انسانی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ اس نے دُنیا کی ہر زبان و ادب پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اس نے دُنیا میں کئی لفظ متعارف کروائے۔ جن میں قرنطینہ، لاک ڈاؤن، سماجی فاصلہ، سینیٹائزر وغیرہ۔ ایک اندازے کے مطابق ان الفاظ کی تعداد انیس کے قریب ہے، جو ۲۰۲۰ء میں متعارف ہوئے۔

وباء کے ادب پر اثرات:

کرونا کی وباء نے قلمکاروں اور ادیبوں کو اپنی طرف راغب کر دیا، اور انسانیت پر براہ راست پڑنے والے اثرات کو زیرِ بحث لایا، اور اعلیٰ قسم کے تخلیقات وجود میں آئے۔ کرونا کی وجہ سے لاک ڈاؤن تھا، تمام لوگ جبری تنہائی پر مجبور ہو گئے تھے۔ تنہائی ہماری زندگی میں بے پناہ اہمیت کے حامل ہے۔

"یہ ادب کو فروغ دیتی ہے، اور ادیب کی فکری اور تخلیقی صلاحیت کو بڑھاوا دیتی ہے۔ وباء کے اس عالم میں ادباء اور شعراء نے اپنی اندرونی جبری تنہائی، وحشت اور اکتاہٹ کو محسوس کیا، اور بے بسی، لاچارگی، ڈر، دہشت اور بے کیفی و بے یقینی کے عالم میں سہمے ہوئے جذبات و احساسات کو موضوع بنا کر لکھنا شروع کیا"۔(۳۳)

کرونا کے موضوع پر اب تک ۶۰۰ سے زائد تخلیقات اُردو، پنجابی، سندھی، پشتو، سرائیکی، ہندکو، انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع کی جاچکی ہیں۔

"اکادمی ادبیات کے مطابق ۳۰ اپریل ۲۰۲۰ء تک کرونا سے متعلق شائع ہونے والی تخلیقات میں سے تین بہترین تخلیقات کو "پاکستان اُمید زیست ایوارڈ" سے نوازا گیا"۔(۳۴)

کرونا وائرس نے خوف، ڈر، اور وحشت پھیلائی۔ یہ سب اس وقت سامنے آیا کہ جب انسان جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے آسمان کو چھونے کے دعوے کر رہا تھا۔ لیکن چھوٹے وائرس کے سامنے بے بسی اور لاچارگی کا نمونہ بنا رہا۔ اس وباء نے انسانی زندگی کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر ہوا۔ معاشرتی، سماجی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور تعلیمی سرگرمیاں محدود ہو کر رہ گئیں۔

سڑکیں ویران، بازار خالی، گلیاں خاموش اور راستے سنسان ہو گئے۔ ہم اگر ماضی پر نظر دوڑائیں، تو پتا چلتا ہے کہ دُنیا میں جب بھی کوئی تبدیلی رونما ہوئی ہے تو ادب پر براہ راست اس کے اثرات پڑتے ہیں۔ چونکہ ادیب اور شاعر کسی بھی قوم اور معاشرے کے لیے آنکھ اور کان کی حیثیت رکھتا ہے، اور ان کے اجتماعی شعور اور جذبات و احساسات کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ان تبدیلیوں کو سچائی، دیانتداری اور نفاست کے ساتھ ادب کا حصہ بنالیتا ہے۔

ماضی میں لکھاریوں نے مختلف قسم کے حالات کو اپنے مخصوص رنگ میں تحریری صورت میں پیش کیا ہے۔ دیکھا جائے تو ان فن پاروں میں آفاقی رنگ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے کہ:

سرہانے میر کے کوئی نہ بولو
ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے
کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو (۳۵)

کرونائی ادب نے اُردو ادب کے دامن کو تنہائی، خوف، وحشت، جبر، بے بسی، بے کیفی، لاچارگی، کم مائیگی، اُمید اور یاس جیسے موضوعات سے بھر دیا۔ جس سے نہ صرف اُردو ادب کی وسعت میں اضافہ ہوا، بلکہ انسانی نفسیات کی مختلف گرہیں بھی کھل گئیں۔ اُمید ہے مستقبل میں اس سے ادب کے نئے گوشے وا ہونگے۔

انڈیپینڈنٹ اُردو ڈاٹ کام کو انٹرویو دیتے ہوئے مستنصر حسین تارڈ نے اس حوالے سے کہا کہ:

"اس جبری فرصت یا تنہائی، سانے جو نام بھی دیں، اس میں عام افراد کے لیے ایک خوف اور ڈر کا عنصر ہے۔ ماحول میں ایک ویرانی اور تاریکی کا احساس گھلا ہوا ہے، لیکن ادیبوں کے لیے یہ تنہائی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ میں گزشتہ کئی دہائیوں سے لکھ رہا ہوں اور میری یہ مصروفیت مسلسل اور مستقل ہے۔ میں پابندی سے کئی گھنٹے ہر روز صرف لکھنے یا پڑھنے کا کام کرتا ہوں"۔(۳۶)

یہ کام تب ہی ہو سکتا ہے، جب آپ گھر میں رہیں گے اور پوری توجہ اس کام کو دیں گے۔ اب کورونا کی وبا نے سب کو جبری تنہائی میں دھکیل دیا ہے۔ پھر انھیں یہ زیادہ وحشت ناک یا اکتاہٹ بھرا کام محسوس ہو رہا ہے۔ جن کے ہاں تخلیقی سرگرمی نہیں ہے، یا جو لکھنے پڑھنے کے کام سے وابستہ نہیں ہیں۔ ورنہ اس ماحول میں بھی کام کرنے والے کام کر رہے ہیں۔

مشہور مزاح نگار انور مقصود کا کہنا ہے کہ:

"ایک وائرس نے کھانسی اور بخار کے ذریعے پوری دُنیا کو روک دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اس بات پر فخر کرتے رہیں کہ انسان نے چاند کو تسخیر کر لیا اور مریخ پر پہنچ گیا۔ لہٰذا یہ قیامت جیسا ہی دور ہے جس سے اس وقت گزر رہے ہیں کہ دُنیا کئی دنوں سے رُکی ہوئی سی ہے"۔(۳۷)

اس دور میں تخلیق شدہ ادب کو کرونائی ادب کا نام دیا گیا ہے۔ یہ ادب نہ صرف موجودہ بلکہ مستقبل میں بھی آنے والے وبائی صورتحال کے دوران انسانی نفسیات، احساسات اور حالات کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو گا۔

حوالہ جات

۱. www.punjab.com

۲. qalamkitab.com

۳. ایضاً

۴. ایضاً

۵. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۷۵

۶. ایضاً

۷. ایضاً

۸. ایضاً، ص:۷۶

۹. ایضاً

۱۰. ایضاً، ص:۷۷

۱۱. ketabonline.com

۱۲. https://darulifta-deoband.com/home/ur/penal-code/48634

۱۳. ایضاً

۱۴. ایضاً

۱۵. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۷۸

۱۶. ایضاً

۱۷. https://darulifta-deoband.com/home/ur/penal-code/48634

۱۸. ایضاً

۱۹. https://ur-m-
wikipedia/wiki/%D8%B9%D8%A7%D8%B4%D90%88%D8%B1%D8%A7

۲۰. ایضاً

۲۱. ایضاً

۲۲. ایضاً

۲۳. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۸۰

۲۴. ایضاً، ص:۸۱

۲۵. https://www.rekhta.org/ghazals/sastii-shohrat-hassil-karne-kuuchon-men-chaubaaron-men-feroze-natique-khusro-ghazals?lang=ur

۲۶. ایضاً

۲۷. ایضاً

۲۸. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۸۳

۲۹. ایضاً

۳۰. https://m-facebook.com/story-php?story-fbid=pfbid034bpe5RaYBmSzk2nr4E7re6bhJu7FRTJvh5Cxplvug83aaxBFCJWXEWtSdKLWtt/id=1756666561225763

۳۱. ایضاً

۳۲. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۸۶

۳۳. https://hamariweb.com/articles

۳۴. ایضاً

۳۵. ایضاً

۳۶. ایضاً

۳۷. ایضاً

باب چہارم

تبصرہ جات کتب

تبصرہ کسے کہتے ہیں؟

تبصرہ کے لغوی معنی:

تبصرہ کے لغوی معنی ہیں، بصارت دینا یا بینا کرنا، مگر اصطلاح میں کسی بات کے متعلق روشنی ڈالنا، اس کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنا اور اس کی توضیح و تفصیل بیان کرنا تبصرہ کہلاتا ہے۔

"تبصرہ کو انگریزی میں Review کہتے ہیں۔ یہ تنقید سے مختلف چیز ہے۔ اس میں کسی تحریر یا کتاب کے موضوع، اس کی قدری حیثیت اور اس کے بیرونی حسن و عیب کو اجمالاً بیان کیا جاتا ہے۔ جب کہ تنقید میں تفصیلاً جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس طرح تنقید کا منصب کہیں بلند اور اعلیٰ وارفع ہوتا ہے"۔(۱)

تبصرہ نگاری:

"تبصرہ نگاری ایک دلچسپ فن ہے۔ تبصرے ملکوں پر بھی کیے جاتے ہیں اور نظاموں پر بھی۔ تبصرے شخصیات پر بھی کیے جاتے اور کتابوں پر بھی کیے جاتے ہیں۔ تبصرے حالات پر بھی کیے جاتے ہیں اور موسموں پر بھی۔ تبصرہ کائنات میں موجود ہر ہر چیز، ہر ہر کام اور ہر ہر شے پر ہو سکتا ہے"۔(۲)

تبصرے کرنے کے کئی مختلف انداز ہیں۔ تبصرے کی کوئی بھی قسم ہو اور تبصرے کا کوئی بھی انداز ہو۔ لیکن ایک بات قدرِ مشترک ہے کہ تبصرہ نگار کا ذہین فطین، وسیع المطالعہ، گہری نظر، حاضر جواب، گرم سرد چیدہ، ماہر، پڑھا لکھا، تیز طرار، قادر الکلام اور فی البدیہہ کہنے جیسی صفات کا حامل ہونا ضروری ہے۔

اگر آپ کسی ملک کے نظام پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس ملک میں کونسا نظام رائج ہے؟ اس ملک میں کسی قسم کی نظریات کی حامل جماعتیں ہیں؟ مذہبی ہیں یا سیکولر ہیں؟ سوشلسٹ ہیں یا سرمایہ داریت کے علمبردار ہیں؟ وہ کیا چاہتی ہیں؟ کون سے نظام کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں؟ تو جس چیز، کام اور شے پر تبصرہ نگار تبصرہ کرنا چاہتا ہے، اس کے بارے میں مکمل معلومات ہونی چاہئیں۔ ورنہ تبصرہ صحیح نہیں ہو گا، تبصرہ نگار تبصرے کا حق ادا نہیں کر سکے گا۔ پھر اسے شرمندگی اُٹھانا پڑے گی سب کی، لوگ ہنسیں گے۔

"جب تبصرے کا اصطلاحی معنی مراد لیا جائے تو اس وقت خاص اور معروف تبصرہ مراد لیا جائے"۔(۳)

اور وہ کتب، رسائل، جرائد اور مطبوعات پر تبصرہ، تنقید اور نقد و نظر کرنا۔ لیکن جب لغوی معنی مراد لیا جائے تو پھر عام تبصرہ مراد ہوتا ہے۔ یعنی ہر چیز اور کام پر تبصرہ کرنا۔ تبصرے کے لغوی معنی ہیں۔ تنقید کرنا، توضیح کرنا وغیرہ۔ اس کے معنی کے لحاظ سے آپ کسی بھی چیز پر تبصرہ کر سکتے ہیں۔ اس وقت دونوں ہی معنی مراد ہیں۔ یعنی کتابوں اور مطبوعات پر تبصرہ کرنا بھی اور اس کے علاوہ دُنیا جہاں کی چیزوں اور کاموں پر تنقید، تبصرے اور رائے دینا بھی۔

تبصرہ کرنے کے بنیادی اُصول:

تبصرہ کرنے کے بنیادی اُصولوں میں سے چند ایک یہ ہیں۔ کسی بھی کتاب پر تبصرے کے لیے ضروری ہے کہ اس کتاب سے پوری طرح واقفیت پیدا کی جائے۔ کتاب کے مصنف اور مؤلف کو جانچا، پرکھا جائے کہ یہ کون ہیں؟ اس کا عملی اور فنی بیک گراؤنڈ (Background) کیا ہے؟ یعنی سب سے پہلے مصنف اور مؤلف سے تعارف اور آگاہی حاصل کی جاتی ہے۔ دوسرے نمبر پر کتاب کے موضوع کو سمجھا جائے کہ کس موضوع اور فن پر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔(۴)

تبصرے کا مقصد شائع ہونے والی کتاب اور اس کے مصنف کا اختصار کے ساتھ فوری تعارف ہوتا ہے، تاکہ قارئین کو کتاب کے مطالعے کی ترغیب ملے۔ مصنف اور تصنیف دونوں کا تعارف، عصری ادب سے ان کا رشتہ، تصنیف کی ظاہری بناوٹ، اس کی قیمت اور مقام اشاعت وغیرہ کا ذکر تبصرہ نگاری کے لوازم ہیں۔

گوش بر آواز:

بھارت شہر کلکتہ سے تعلق رکھنے والے مشہور شاعر، صحافی، کالم نگار، بیشتر کتب کے مؤلف و مصنف اور پیام مشرق کے منتظم اعلیٰ مشتاق در بھنگوی نے اپنی دن رات محنتوں اور کاوشوں سے منفرد لازوال کام کرنے کی ٹھانی۔ عالمی سطح پر اُردو ادب سے تعلق رکھنے والے شعرا و شاعرات کی ڈائریکٹری "گوش بر آواز" کے نام سے مرتب کی۔

"مشتاق در بھنگوی کا اصل نام انصار الحق ہے۔ انھوں نے شاعری کا آغاز ۱۹۸۰ء میں کیا۔ ان کے والد مرحوم کا نام شیخ نور محمد تھا اور والدہ حامدہ خاتون تھیں۔ مشتاق در بھنگوی ۵ فروری ۱۹۵۸ء بسائی پٹی، در بھنگہ (بہار) اپنے آبائی وطن میں پیدا ہوئے۔ آپ صحافت کے پیشے سے منسلک تھے، جس کا نام روزنامہ اخبار مشرق کلکتہ تھا"۔(۵)

کیا بات ہے جو گوش برآواز ہے دُنیا
کس شہر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے (۶)

(بدر محمد ویشالی، بہار)

کس قدر پُر کیف منظر یہ دکھائے گی سرورؔ
جب ادب کی یہ ذلیخا مسکرائے گی سرورؔ
آرہی ہے "گوش برآواز" نامی اک کتاب
یہ خبر چرخِ کہن تک جگمگائے گی سرورؔ (۷)

(ڈاکٹر قمر سرور، احمد نگر، مہاراشٹر)

گوش برآواز کا انداز ہے سب سے جدا
اے ادب والو سنو! یہ راز ہے سب سے جدا
دُنیا کے شاعروں کا اک حسیں سنگم ہے یہ
واقعی مشتاقؔ کی آواز ہے سب سے جدا

(رخشاں ہاشمی، مونگیر، بیہار)

پیشگی منظوم تاثرات کا سلسلہ صرف ہندوستان کی سرحدوں تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس کتاب کی افادیت کے بارے میں پڑوسی ملک پاکستان کے شعراء کو جب علم ہوا تو انہوں نے بھی اپنے منظوم تاثرات کا اظہار کیا جن میں ہر مکتبہ فکر کے شعراء شامل ہوئے۔ چنانچہ سرحد پار سے موصول ہونے والے ارضِ پاک کے شعراء کے بھی چند قطعات پر توجہ مبذول فرمائیں۔

اک تعلق جڑ گیا ہے راز سے ہم راز کا
یہ جریدہ دوستو! ہے مختلف انداز کا
اس کی آمد کے یقیناً ہم سبھی مشتاق تھے
اک زمانہ منتظر تھا "گوش برآواز" کا (۹)

(طارق تاسی، پاکستان)

طائر باغِ سخن سب مائل پرواز ہیں
خوبصورت رنگ ہیں اور خوش نمانداز میں
آپ کے ہمراہ سب ہی باعثِ اعزاز ہیں
ہے سفر ادراک کا ہم "گوش برآواز" ہیں (۱۰)

"گوش برآواز" کے تعلق سے شعراء نے جو قطعات کی صورت میں منظوم مبارکبادی کے پیغام مشتاق در بھنگوی کے نام ارسال کیے ہیں۔ اس سے قبل ادبی حلقے میں کسی صاحب کتاب کے حق میں پذیرائی کی ایسی مثال نہیں دیکھی گئی۔ علاوہ ازیں "گوش برآواز" کی اشاعت پر مشتاق در بھنگوی کو کئی ادبی اور سماجی اداروں کی جانب سے استقبالیہ بھی دیا گیا جن میں "نئی روشنی"، مٹیابرج اور "اُردو محفل" کلکتہ پیش پیش رہی اور آج "سرد موسم کی ہوا" کی شاعرہ محترمہ ڈاکٹر نگار سلطانہ نے مشتاق در بھنگوی کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب کا انعقاد اپنے چیمبر کئیبر اینڈ کیورہ واٹ گنج، خضر پور میں کیا ہے۔ یہ آخری نشست نہیں ہے، اس طرح کی اور بھی بہت ساری اعزازی نشستیں استقبالیہ کی صورت میں مشتاق در بھنگوی کے لیے منتظر ہیں۔

اہلِ دُنیا کو بتاؤں بات میں اک راز کی
کوئی کاوش آج تک آئی نہ اس انداز کی
حضرت مشتاقؔ کو بھی اس کا اندازہ نہ تھا
اس قدر تشہیر ہوگی "گوش برآواز" کی (۱۱)

(شمیم انجم وارثی)

گوش بر آواز کا اجراء ۶ اگست ۲۰۱۸ء کی شام مغربی بنگال اُردو اکیڈمی کے مولانا آزاد آڈیٹوریم میں زیرِ اہتمام اخبار مشرقی پبلیکیشنز ممبر پارلیمنٹ جناب ندیم الحق کے دستِ مبارک سے ہوا۔ صدارت کے فرائض جناب ف۔ س اعجاز نے انجام دیئے اور نقابت کا فریضہ ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے بحسن وخوبی ادا کیا۔

"گوش بر آواز" کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب یہ کتاب اشاعت کے مرحلے سے گزر رہی تھی اس درمیان بہت سے شعراء نے اپنے منظوم تاثرات قطعہ کی صورت میں مشتاق دربھنگوی یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں، کہ انہوں نے ساری دُنیا کے شعراء سے رابطہ قائم کرکے اُن کے نام پتے، ای میل اور موبائل نمبر کے علاوہ ہر شاعر کا ایک شعر درج کرکے کل ۲۷۶۴ شاعروں کو "گوش بر آواز" میں متعارف کرانے کا فریضہ ادا کیا"۔(۱۲)

اُن کا یہ کارنامہ برسوں کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ جس کے نتیجے میں عالمی سطح پر ادب نوازوں کو بھی ان شعراء و شاعرات سے متعارف ہونے کا شرف حاصل ہوا، جو دور دراز سات سمندر پار آباد اُردو بستیوں میں برسوں سے ادب تخلیق کرتے رہے، لیکن وہ اپنے محدود علاقے ہی تک اپنی شناخت رکھتے تھے۔ گوش بر آواز انہیں مشہور زمانہ کردیا۔

"پہلا چہرہ" کے خالق:

"جس شاعر سخن شناس شخصیت پہ میں لکھ رہی ہوں، یہ ایک زندہ دل شخصیت ہیں۔ سادہ لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جن کا نام قربان صاحب ہے۔ جن کا تعلق ڈیرہ غازی خان کے ایک شہر کوٹ چھٹہ سے ہے۔ اور یہ ایک ریٹائرڈ فوجی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ساتھ ساتھ ادب سے بھی ان کا لگاؤ رہا ہے"۔(۱۳)

ان کی دو کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی کتب پر غازی یونیورسٹی ڈیرہ غازی خان میں مقالہ بھی لکھا جا چکا ہے۔ زندہ دلی شخصیت کی وجہ سے بزرگی اور کمزوری کے باعث بھی اپنے ادبی جوش و جذبے کو اُنہوں نے زندہ رکھا ہوا ہے۔ اپنی جسمانی کمزوری کو بالائے تاک رکھ کر اپنے ادبی جوش وجذبے کو انہوں نے زندہ رکھا ہوا ہے۔ کمال کی شاعری کرتے ہیں۔ زیادہ تر اِن کا غزل گوئی پر کام ہے اور نظمیں بھی لکھتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ کا نام "پہلا چہرہ" ہے۔ قربان صاحب چونکہ سادہ لوح طبیعت کے مالک ہیں اپنے نام اور کام میں بے مثال ہیں۔ ادبی قد آور شخصیت اور منفرد اسلوب کے شاعر ہیں۔ ان کے شعری مجموعہ پہلا چہرہ کا شعر ملاحظہ ہو۔

یوں تو دُنیا میں دیکھے ہیں لاکھوں ہی چہرے
یہ "پہلا چہرہ" ہے جو دِلرُبا سا لگتا ہے

"یہ شاعری کا مجموعہ آپ کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ جس کے ۱۴۴ صفحات ہیں۔ اس میں مناجات، نعت، عاشور، نوحہ، ماں، حُب الوطنی، غم دوراں و غم جاناں اور کہیں کہیں اس میں محبت کے گیت بھی ملتے ہیں"۔(۱۴)

ہر صفحہ پلٹنے پر نئے نئے موضوعات سے ملاقات ہوتی ہے، اور لفظ لفظ اپنے اندر کی گہرائی سمیٹے ہوئے ہیں۔

زندگی
زندگی شراب ہے
پیتے ہیں تو تلخیاں
نہ پئیں عذاب ہے
زندگی خراب ہے
زندگی عذاب ہے (۱۵)

خوبصورت اسلوبات، خوبصورت الفاظ کا چناؤ کا استعمال ان کی ممتاز شاعری میں ہے۔ ان کی شاعری میں حقیقت کے رنگ ہیں۔ درد و غم جمع کر کے اپنی قلم کو تمام محسوسات کا تنکا تنکا جوڑ کر دل کے لہو میں اپنی قلم ڈبو کے کاغذ پر حرف کی صورت میں جمع کر کے اُنھوں نے حرف لفظوں کی صورت زندہ و جاوید ہو جاتے ہیں۔

ان پر قلم کاری کا جادو چھا جاتا ہے۔ ان کے لفظوں میں زندگی کے سارے درد پہنا ہوتے ہیں۔ یہ تمام تر خوبیاں ان کے کلام میں ملتی ہیں۔ ان کے کلام زندگی کے تمام تر حالات کو بیان کرتے ہوئے شاعری کا رنگ دھرتے ہیں۔ ایک طرف وہ زندگی کو خوشی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو اک طرف غمزدہ ہو کر زندگی کو اپنے درد بھرے الفاظ قلم کے نیچے سے گزارتے ہیں۔ چونکہ یہ زندہ دل شخصیت اور ادبی جوش کے مالک شاعر ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری زندہ دلی کا ثبوت دیتے ہیں۔ کیونکہ قربان صاحب ایک سادہ لوح طبیعت کے آدمی ہیں اس لیے اُن کی شاعری میں بھی سادہ اسلوبات کا مرقع ملتا ہے۔ اس لیے ان کی شاعری بھی سادہ طبیعت کی ہے۔

خیالی کے حقائق:

"معظمہ نقوی نے اپنی تصنیف نوائے نقوی نثری تخلیقات میں جسارت خیالی کی زندگی یعنی ادبی زندگی اُن کے ادبی کام کو اپنی تصنیف میں خیالی کے حقائق کا نام دیا ہے۔ جسارت خیالی ایک ادیب اور انسان دوست شاعر ہیں۔ ان کا قلمی نام جسارت خیالی اور ان کا مکمل نام منظور حسین ہے۔ جسارت خیالی کی پیدائش ۱۹۵۴ء میں تھیم آباد، پہاڑ پور لیہ (پنجاب) پاکستان میں ہوئی"۔(۱۶)

ان کے والد کا نام اللہ بخش جو کہ محکمہ ریونیو میں ملازم تھے۔ انھوں نے پانچ تصانیف لکھیں۔ اُن کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

جس روز سے اخلاق کا نکلا ہے جنازہ
سچ کی کوئی انسان گواہی نہیں دیتا (۱۷)

جسارت خیالیؔ کے بارے بانگ و بالا دعویٰ نہیں کرتا، لیکن جسارت خیالی کے لیے اس سے بڑھ کر کیا ہو گا کہ آپ نے غالب کی زمین میں پورا شعری مجموعہ لکھ ڈالا ہے۔ شاعری انسانی نفسیات، خیالات، واردات اور کیفیات کو خوبصورت الفاظ میں بیان کرنے کا نام ہے۔ یوں تو شاعری کی ہر صنف کی اپنی اہمیت ہے۔ لیکن نقاد شاعر کو اس وقت تک شاعر نہیں مانتے۔ جب تک وہ غزل پر طبع آزمائی نہ کرے۔ غزل شاعری کی سب سے پر کشش و پر تحسین صنف ہے۔ جس میں محبوب کے ناز و نیاز، فطرت کے حسین مناظر اور انسانی نفسیات میں موجود پیار و محبت کے علاوہ معاشرتی نابرابری و ناانصافی کے موضوع پر شاعر قلم آزمائی کرتے ہیں۔ اُردو شاعری کے ابتدائی ادوار میں غزل کا موضوع محبوب و رومانویت کے گرد گھومتا تھا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اُردو غزل میں جدت آتی گئی اور غزل میں وسعت پیدا ہوئی تو اس کے عنوان میں فلاسفہ اور نفسیات بھی شامل ہو گئے۔

"کارل مارکس نے معاشرتی نابرابری، سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اپنی آواز بلند کی تو اُردو شاعری میں بھی اس کی جھلک دیکھنے کو ملی اور فیض، جالب، اور احمد فراز کے علاوہ دیگر شعراء مارکس کے ہم آواز اور ہمنوا بن گئے"۔ (۱۸)

ہر شاعر کا مقصد معاشرے میں پیار و امن کا قیام اور ظلم و ناانصافی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ یوں ہر نیا شعری مجموعے کا استعبال اس اُمید سے کرتی ہوں کہ یہ معاشرے میں امن کا درس اور شعور کی روشنی کے چراغوں کو روشن کرلے گا۔ ایسا ہی ایک شعری مجموعے، غالب کے نقش قدم پر میرے ہاتھوں میں ہے۔ اس شعر مجموعے کے تخلیق کار جسارت خیالیؔ ہیں۔ جن کا تعلق لیہ کی دھرتی سے ہے۔

جنہوں نے اُردو ادب کے بڑے نام ڈاکٹر خیال امروہوی سے شاعری کی باریکی بینیوں کو سیکھا، بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ جسارت خیالیؔ نے سیاسی عدم استحکام، معاشرتی ناانصافیوں اور ظلم کے خلاف جہاد کرنا، اپنے استاد خیال امروہوی صاحب سے سیکھا۔ اور آج تک ایسے موضوعات پر لکھ رہے ہیں جن پر کم شعراء قلم اُٹھاتے ہیں۔

معظمہ نقوی کے بقول:

"جسارت خیالیؔ سے میری ذاتی طور پر جانکاری نہیں ہے۔ ان کا شعری مجموعہ میرے رفیق اور محسن مقبول ذکی مقبول کے توسعت سے مجھ تک پہنچا ہے۔ خیالی صاحب کی شاعری پڑھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے۔ آپ باغی ہیں۔ آپ حبس زدہ معاشرتی نظام، کرپٹ سیاسی نظام، کلاس سسٹم کی نابرابری اور ناانصافی کے باغی ہیں۔ شاید میں کچھ غلط بھی نہ ہوں، کیونکہ انگلش فلاسفی برینڈرر سل کے مطابق، شاعری انسانی شعور اور لاشعور کے ملاپ سے پھولتی ہے"۔ (۱۹)

میں جسارت خیالی کے بارے میں بانگ و بالا دعویٰ نہیں کرتا، لیکن جسارت خیالی کے لیے اس سے بڑھ کر کیا ہو گا، کہ آپ نے غالب کی زمین میں پورا شعری مجموعہ لکھ ڈالا ہے۔

نہ بے آس ہوتے پنچھی، نہ یہ گھونسلے اُجڑتے
کہ چمن سے باغباں کو جو اگرچہ پیار ہوتا

لاشوں کی سیاست کا چلن عام ہوا ہے
جس گھر کو بھی دیکھا وہی مقتل ہی بنا ہے

حصار جبر میں جذبے تمہارے ہی تو کم نکلے
بغاوت کا علم لے کر مگر پھر بھی تو ہم نکلے (۲۰)

جسارت کی تنقیدی مضامین پر مشتمل نقد سخن کے نام سے کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ یہ جسارت خیالی کا ادبی کام ہے۔ خیالی صاحب کے اشعار محض وقتی تسکین یا وقت گزاری کے لیے نہیں ہیں، بلکہ آپ کے اشعار گہرائی کے بھرپور اور سوئے ضمیر کو جگانے والے ہیں۔ کسی شاعر کے لیے بڑی سعادت مندی کی بات ہے، کہ اس نے غالب کی زمین پر پورا شعری مجموعہ کہہ ڈالا۔ جو کہ شاعر کی ادبی مہارت اور شاعری سے گہری وابستگی جانکاری کو ظاہر کرتا ہے۔ جسارت خیالی کے شعر غالب کے شعر کے ساتھ:

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی (۲۱)

ہم کو آتا ہے خوشی سے جینا (غالب)
گر نہیں سکھ تو مصیبت ہی سہی (جسارت خیالی) (۲۲)

یہ جسارت خیالی کا ادبی کام ہے، جو آپ جہد مسلسل، سنجیدگی، اور نیک نیتی سے سرانجام دے چکے ہیں۔ یہ آپ کے بڑا ہونے اور آپ کی ناموری کے لیے کافی ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں (۲۳)

(غالبؔ)

جو سچ خون دل سے ہی کرتے رقم ہیں
یہاں ہاتھ اُن کے قلم دیکھتے ہیں (۲۴)

(خیالیؔ)

اس طرح کے بے شمار اشعار ہمیں غالب اور خیالی کے خوبصورت الفاظ کی ہم آہنگی میں ملتے ہیں۔ خیالی نے غالب کی زمین پر کام کرنے کی یہ کاوش جدید تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کی ہے۔ یہ عمدہ کاوش اُردو ادب سے رغبت رکھنے والے قارئین کے لیے عمدہ تحفہ ہے۔

نثری ہائیکو کی پہلی شاعرہ

ہائیکو جاپانی شاعر کی ایک صنف ہے۔ اپنی مقبولیت کی وجہ سے دُنیا کی اور زبانوں میں بھی مروج ہے۔ عام طور پر یہ ۳ سطروں پر مشتمل ہے۔ ایک ہائیکو میں ۱۷ الفاظ (Syllable) استعمال ہوتے ہیں۔ پہلی میں ۵ دوسری میں ۷ اور تیسری میں بھی ۵۔ ہائیکو میں فطری مظاہر کی زبان میں بات کی جاتی ہے۔

"یہ ایک قدیم جاپانی صنف ہے۔ اس صنف کو اُردو اور انگریزی میں اپنایا گیا ہے۔ اس میں صرف تین مصرعے ہوتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ان تینوں مصرعوں کے جملہ ارکان (Syllable) سترہ ہوں"۔(۲۵)

اُردو تک ڈکشنری اور انسائیکلوپیڈیا میں ہائیکو کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"جاپانی طرزِ سخن سے مشابہ چھوٹی بحر کی مختصر نظم جو صرف تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں ایک خیال مکمل کرنا ہوتا ہے۔ اس میں ردیف قافیے کی قید نہیں ہوتی"۔(۲۶)

"جدید اُردو ادب میں جمیل الدین عالی، ادا جعفری اور ذکیہ غزل نے "ہائیکو" اور ہوں کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔ ہائیکو جاپانی شاعری کی ایک صنف ہے۔ اپنی مقبولیت کی وجہ سے دُنیا کی اور زبانوں میں بھی مروج ہے۔ عام طور پر یہ ۳ سطروں پر مشتمل ہے"۔(۲۷)

پروفیسر رحمت یوسفزئی اپنے آرٹیکل ہائیکو اور اُردو شاعری مزید وضاحت کرتے ہیں ان کے خیال میں:

"جب وقت بدلتا ہے تو اس کے ساتھ ہر شے بدلتی ہے۔ انسانی فکر کے زاویئے بدلتے ہیں، خیالات اور رُجحانات بدلتے ہیں، فیشن بدلتا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اُردو شاعری کو ایک نیا موڑ دیا، چونکہ موضوعات بدل رہے تھے۔ اس لیے اسلوب میں تبدیلی آنا ایک لازمی امر تھا۔ لہجہ میں ایک آہنگ کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ دوسرے ممالک کی زبانوں میں مروجہ اصناف کو اُردو میں برتنے کی تجربے کیے گئے "ہائیکو" اسی طرح کا ایک تجربہ ہے"۔(۲۸)

ہائیکو اصل میں جاپانی صنف سخن ہے، وہاں ابتدائی دور ہی سے مختصر نظمیں قبول رہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہندوستان میں دوہے یا ایران میں رباعی اور غزل کے اشعار یا قدیم عربی ادب میں قصائد کے دور عروج کے قبل ارجوزۃ یا اراجیز قبول عام کی سند رکھتے تھے۔ اُردو ہائیکو کہنے کا رواج اس وقت شروع ہوا۔ جب ۱۹۶۳ء میں شاہد امد دہلوی نے رسالہ ساقی کا "جاپان نمبر" شائع کیا۔

"اس رسالے میں فضل حق اور تمنائی نے جاپانی ہائیکو کے اُردو تراجم پیش کیے۔ فضل حق کا ترجمہ نثر میں تھا، جبکہ تمنائی نے تین مصرعوں میں ترجمہ کیا۔ جس کا حوالہ ڈاکٹر عنوان چشتی کی کتاب "اُردو شاعر میں ہئیت کے تجربے" میں بھی ملتا ہے۔ تمنائی کا ترجمہ یہ ہے: یہ دُنیا شبنم کے قطرے جیسی ہے، بالکل شبنم کے قطرے جیسی، پھر بھی کوئی حرج نہیں"۔(۲۹)

ہائیکو کے نام سے جو نظمیں ملتی ہیں ان میں تقریباً سبھی نظمیں ایسی ہیں۔ جنہیں ہائیکو کہتے ہیں۔

"انیلا طالب کا شمار نسائی ادب میں اُن قابل رشک لکھاریوں میں ہوتا ہے جنہوں نے نہایت کم عرصے میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھلا کر اپنی ہستی کو منوایا۔ اپنے کم سنی کے دور سے ہی اُنہوں نے ادب کی طرف رجحان کیا۔ ادب کا ورثہ اُن کو اپنے علمی و ادبی گھرانے سے وراثت میں ملی"۔(۳۰)

سادات گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے اُن کی طبیعت میں خاصہ تصوف پایا جاتا ہے۔ جس کی نمایاں جھلک آپ کے کلام میں جابجا ملتی ہے۔

"محبت الٰہی و محبوب الٰہی کا ذکر ثنائے پنجتن پاک ہی آپ کا موضوع سخن ہے۔ آپ کا کلام عشق مجازی سے نا آشنا لگتا ہے۔ آپ کا پہلا مجموعہ "چھولو آسمان" ہے یہ نثری مجموعہ ہائیکو چھیانوے صفحات پر مشتمل ہے"۔(۳۱)

جس میں "طالبِ حق" کے عنوان سے آپ کی محسنہ محترمہ نزہت اصغر اپنے اظہارِ خیال میں کہتی ہیں کہ۔

"انیلا طالب نوجوان خواتین شعراء میں ایک قابل غور قابل فخر اور دلکش اضافہ ہیں"۔(۳۲)

آپ کے کلام میں فلسفہ حیات اور عشق حقیقی اور فطر کے مناظر سے گہری رغبت ملتی ہے۔ شاعری میں جدت کا عکس بھی ملتا ہے۔ روحانی طور پر آپ ارفع کریم سے والہانہ عقیدت رکھتی ہیں۔ انہیں اپنا آئیڈیل مانتی ہیں۔ تمام تر کامیابیاں اُن کے نام منسوب کرتی ہیں۔

"آپ نہ صرف ایک شاعرہ ہیں بلکہ پختہ ناول نگار اور افسانہ نگار بھی ہیں۔ ادبی رسائل و جرائد اور ڈائجسٹ اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اُردو نثر آپ کی پہچان کا مکمل حوالہ ہے"۔(۳۳)

آپ کی پانچ کتب اس وقت شائع ہو چکی ہیں۔ انیلا طالب کی علمی و ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کو علمی و ادبی تنظیموں نے بے شمار اعزازات سے بھی نوازا ہے۔

"۲۰۱۸ء میں شائع ہونے والے آپ کے ہائیکو مجموعہ "چھولو آسمان" کو اُردو ادب کا پہلا نثری ہائیکو مجموعہ قرار دیا۔ اُمید ہے کہ ادب کی یہ کلی جس لگن سے ادب کی خدمت میں لکھ رہے ہے۔ اللہ ان کو عروج تک پہنچادے"۔(۳۴)

نظم آراستہ اور گل بخشالوی

گل بخشالوی

"والدین کا دیا ہوا نام سبحان الدین اور قلمی نام گل بخشالوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ نے میٹرک پرائیویٹ سکول سے کی۔ ان کی پیدائش ۳۰ مئی ۱۹۵۲ء میں بخشالی ضلع مردان خیبر پختونخواہ کے مقام پر ہوئی۔ آپ ایک شاعر، کالم نگار، ادب دوست، ناظم اعلیٰ قلم قافلہ کھاریاں میں ہوئے"۔(۳۵)

آپ نے اپنے ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز ۱۹۸۴ء حال فقیم کھاریاں شہر ضلع گجرات پنجاب، پاکستان سے کیا۔

"آپ پر تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل اُردو گل بخشالوی کی ادبی خدمات ۲۰۱۷ء میں مقالہ نگاری پروفیسر محمد سلیم سندھو نے سرانجام دیا۔ اس مقالہ میں انھوں نے زندگی کے سارے احوال بتائے ہیں"۔(۳۶)

ان کی مادری زبان پشتو ہے، لیکن اُردو سے آپ کو والہانہ محبت ہے۔ بخشالوی صاحب نہ صرف اُردو دوست، بلکہ ایک مخلص، ادب شناس شخصیت کے مالک بھی ہیں۔ اُردو زبان و ادب سے والہانہ عقیدت ان کے اس مقبول عام شعر سے بخوبی لگاسکتے ہیں۔

"ادب دوستی ہے، ادب کی بہاریں زبانوں میں اپنی زبان کو نکھاریں قلم قافلہ میں محبت قلم سے چلو اُردو کی زلفیں سنواریں"۔(۳۷)

گل بخشالوی کی یہ روشن خیالی اور مثبت انداز فکر ان کو اپنے ہم عصر میں نمایاں مقام عطا کر رہی ہے۔ گل بخشالوی اپنے قلم کی نوک کے ذریعے اُردو کی زلفیں سنوار کر اپنی آنے والی نسلوں کے قلب واذہان میں ودیعت کرتے جائیں۔ آپ نے اپنے حصے کا جو دیپ جلایا ہے۔ وہ آج روشن چراغ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اس کی روشنی کے سبب ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ دُنیا بھر سے اُردو ادب کے تمام ستارے ایک کہکشاں کی صورت میں تالیفی مجموعے میں جگمگا رہے ہیں۔

حاصل غزل۔۔۔نمونہ کلام

آتے ہیں انقلاب غریبوں کے خون سے — لاشوں پہ جگمگاتا امیروں کا راج ہے
بے سروساماں تھے جن کو اپنے دل میں گھر دیا — خون میرے دیس کااُن بے گھروں نے کردیا
مقدس ووٹ دے کر ساتھ ہم ان کے کھڑے ہیں — جو اپنے دیس میں کھل کر بغاوت کررہے ہیں
تقدیر کے ہاتھوں جو بھٹکتا ہے مسافر — اجر پہ بھی اُس وقت ستارہ نہیں ہوتا
پریشاں ہوں وطن میں سوچتا ہوں بے حسی کو — بدل جائے گی کب کشمیر کی حالت نہ پوچھو (۳۸)

دلبر مولائی اِک نظر میں:

"دلبر مولائی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ پندرہ نسخے ان کے سرائیکی اُردو زبان میں منظر عام پر آ گئے ہیں۔ جس میں تحقیق و تنقید، تاریخ، سفر نامے، شاعری، انشائیہ وغیرہ ہیں۔ آپ متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ سماجی کارکن کی حیثیت سے آپ کا الگ مقام ہے۔ آپ دُنیاوی و دینی دونوں کو انکساری سے سرانجام دیتے ہیں"۔(۳۹)

آپ ایک ایسے معلم ہیں جو کہ ہمدرد دوست بھی ہیں۔ آپ کی نئی کاوش "دُعائے کمیل" (سرائیکی ترجمہ) اور "پیامِ مومن" کے نام سے اُردو و سرائیکی شاعری کے مجموعے پر منظر عام پر آئے۔ جس میں آپ نے اپنی حقیقی محبت و عقیدت اور مودت اہل بیعت اطہار (علیہم السلام) کا پر خلوص اظہار فرمایا ہے۔

خدایا ہو کرم پنجتن پاکؑ دا صدقہ
ایں قوم دی جھولی غم بشیرؑ تو بھرڈے (۴۰)

"پیام مومن" ۱۲۸ صفحات پر مشتمل مودت کی وہ گلیائے عقیدت ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کی شاعری میں حمد، نعت، منقبت، سہرا، قصیدہ اور استغاثہ شامل ہے۔ ان تمام اصناف میں انہوں نے اپنی فنی مہارت کے جوہر دکھائے ہیں۔ آپ کے کلام و اسلوب میں جدت آمیزی شامل ہے۔ وطن سے محبت کا اظہار بھی آپ نے اپنے انداز میں کچھ یوں کیا ہے:۔

دلبرؔ میں ڈیروی ہوں کہیں پر ہو ملتانی
محفوظ ہاتھ میرے ہیں جھنڈا میرے وطن کا (۴۱)

آپ کی ادبی خدمات اُردو سرائیکی ادب میں لائق صد تحسین ہیں۔ یہ مختصر الفاظ آپ کی ادبی کاوشوں کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتے۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ یہاں پر چند منتخب اشعار پیش کرنا چاہوں گی۔

اب مرید قلم کو ادا چاہیے
نوت کو وسعت ارض و سما چاہیے
غلام ہوں حسینؑ کا
عقیدتِ بلال رضی اللہ عنہ ہے (۴۲)

سائل کو انگوٹھی دی اطاعت الٰہی میں ظاہر ہے، باطن میں سخاوت ہے۔ ان لفظوں میں قاری کے لیے شاعری کی فنی و فکری ابلاغ کا احاطہ کرنا ناممکن نہیں۔ البتہ آپ گمان ضرور ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کے لکھے لفظوں کو معتبر کرے۔ (آمین)

کھوار شاعری کا شیریں شاعر:

"رحمت عزیز چترالی کا نام ادب میں معتبر شخصیات کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ گلستان مصطفیٰ آپ کی کھواری زبان میں نقید شاعری کا اُردو ترجمہ ہے۔ آپ ایک بلند پایہ شاعر، ادیب، محقق اور مترجم ہیں"۔(۴۳)

انہوں نے کالاشہ، کھوار، بروشکی، بلی، گواربتی زبانوں کے لیے بھی الگ الگ موبائل، کمپیوٹر، آئی فون اور آئی پیڈ کے لیے بھی کی بورڈ بنائے ہیں۔ معدومیت کا شکار پاکستانی زبانوں کے لیے یہ پہلی کوشش ہے۔ ادبی کالم نگاری کے ساتھ ساتھ ماہنامہ ظرافت کراچی اور ماہنامہ چاند لاہور میں ہلکے فکاہیہ کالم بھی لکھتے ہیں۔ دو شعری مجموے (اُردو اور کھوار۔ چترالی) زبان میں گلدستہ رحمت اور گلدان رحمت اور کھوار زبان میں طنزیہ و مزاحیہ خطوط کا مجموعہ صدائے چترال کے نام سے کھوار اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔

کھوار زبان میں پہلی بار شاعر مشرق علامہ اقبال کی کتابوں بانگِ درا، بال جبریل، ضرب کلیم، زبور عجم اور ارمغان مجاز کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ جسے وزارت ثقافت حکومت پاکستان، اقبال اکیڈمی اور کھوار اکیڈمی نے باہمی تعاون و اشتراک سے شائع کیا ہے۔ آپ نے کھوار اکیڈمی کے صدر نشین اور انجمن ترقی کھوار کراچی کے صدر کی حیثیت سے کھوار کے لیے بڑا کام کیا۔

"آپ کی ادبی خدمات کا سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔ رحمت عزیز چترالی کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۸۰ء میں شروع ہو چکا تھا۔ آپ کھوار اکیڈمی کے اُردو اور کھوار اخبار "چترال وژن" کے مدیر رہے۔ آپ کی اُردو اور کھوار کتابیں اس زمانے میں کراچی سے شائع ہوئیں"۔(۴۴)

رحمت عزیز چترالی نے نوجوان صحافی حمید الرحمان کے تعاون سے چترال میں بولی جانے والی زبان کھوار کے لیے پہلی کلیدی تختی کھوار کلیدی تختی کے نام سے ایجاد کی، اور کھوار زبان کے مخصوص حروف کے لیے آپ نے یونی کوڈز بنائے۔ پاکستانی یونیورسٹیوں، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی مقالہ پاکستانی زبانوں میں حمد نگاری کی روایت کے لیے کھوار سے اُردو تراجم مقالہ صوبہ سرحد میں طنز و مزاح کی روایت کے لیے کھوار سے اُردو تراجم مقالہ چترال میں اُردو زبان و ادب کا آغاز و ارتقاء کے لیے اُردو مضامین کے ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی لیول کے طالب علموں اور ریسرچ اسکالرز کو چترالی زبان و ادب سے اُردو تراجم کر کے دے رہے ہیں۔ آپ نے وخان کی زبان وخی اور اشکاشمی پر بھی تحقیق کی ہے۔

"ان کے کھوار سے اُردو اور انگریزی تراجم کو لسانی تحقیق میں سند کا درجہ حاصل ہے۔ اور پاکستان ریسرچ اسکالرز آپ کی تحریروں سے بھرپور استفادہ کر رہے ہیں"۔(۴۵)

رحمت عزیز چترالی نے کئی مضامین اپنے مخصوص طنزیہ و فکاہیہ انداز میں تحریر کیے ہیں۔ رحمت عزیز چترالی کی کھوار اور اُردو زبان میں سیاسی، طنزیہ اور مزاحیہ شاعری آج بھی عام آدمی کو ظلم کے خلاف بے باک آواز اُٹھانے کا سبق دیتی ہے۔ رحمت عزیز چترالی کی وجہ شہرت اُردو اور کھوار مزاح نگاری ہے۔

"ایک مرتبہ انہوں نے ریڈیو پاکستان پشاور کے کھوار پروگرام گرزینی وشلی کے میزبان خیر محمد سہیل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ کھوار اور اُردو زبان کے لسانی روابط سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ دونوں زبانیں جڑواں نہیں ہیں" (۴۶)

مزاحیہ شاعری کے ساتھ انہوں نے سنجیدہ شاعری اور نثر میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کے مشہور مجموعوں میں گلدان رحمت (طنزیہ و مزاحیہ اُردو مجموعہ کلام) قابل ذکر ہیں۔ رحمت عزیز چترالی کی اصل وجہ شہرت مزاحیہ شاعری ہی رہی اور انہیں اس سلسلے میں بھرپور پذیرائی ملی۔

اولیاء کے شہر کا باسی:

قیصر عمران مگسی ان کا اصل نام ہے۔ ذاکر ہیں اور طبلائی شاعری کرتے ہیں۔ بڑے بڑے مشاعروں میں یہ شرکت کرتے رہتے ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے یہ فوجی ریٹائرڈ ہیں۔ ان کی کوئی کتاب ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئی۔ ان کا نام اُردو شاعری و مرثیہ نگاری میں پختہ قلمکار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ شعری مجموعہ آپ کے مشقِ سخن اور ادب پروری کا خوبصورت عکس ہے۔

"آپ کے کلام میں عشقِ مجازی اور محبت سے جڑے تمام آلام کی کیفیت ملتی ہے۔ وہاں آپ کے مزاج پہ عشق حقیقی کا غلبہ بھی نمایاں ہے۔ آپ کی محبت کا بنیادی عنصر رب دوجہاں کے بعد آقائے دوجہاں ﷺ اور آل پاک محمد مصطفیٰ (علیہم السلام) ہیں۔ آپ ادب سے والہانہ عقیدت رکھنے کی بناء پر نثر نگاری، کالم نویسی اور نظامت کے میدان میں بھی اپنے فنی جوہر دکھلا رہے ہیں۔ آپ کو ملکی سطح پر کئی اعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہے"۔ (۴۷)

کربلائی شاعر:

"ارشاد ڈیروی کا شمار سرائیکی مرثیہ کے اُستاد الشعراء میں ہوتا ہے۔ درجن سے زائد کتب کے خالق گولڈ میڈلسٹ اور بے شمار اعزازات اپنے نام کرنے والے یہ بزرگ اور سادہ طبیعت کے مالک ادیب و شاعر ہیں"۔ (۴۸)

آپ کی شاعری میں حمد، نعت، ہند، قطع، سہرا، نوحے، نظم، مسدس و منقبت شامل ہیں۔ سرائیکی شاعری میں مرثیہ نگاری پہ آج تک جتنا کام ہوا ہے۔ وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں، لیکن عصرِ حاضر کے "مرزا دبیر" اگر ارشاد ڈیروی کو کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اپنے وسیب کی طرف سے آپ کو کربلائی شاعر کا خطاب دیا جاتا ہے۔

آپ کی قلم باب العلم، شہنشاہ امیر المومنین، مولائے کائنات سرکار (علیہم السلام) کا خاص نظر کرم ہے۔ تبھی تو آپ نے ولا کی مے کا جام پی کر "خمار خم دے" خلق کی تو کبھی قلندری پرواز کر کے پیامِ قلندر تخلیق کر ڈالی۔ آپ کی تصانیف میں ریت سفر، تپتی ریت، خواب پنن سوالی، روگ، ارشاد ڈیروی کے ڈوہڑے، ریت ریت ردا، ڈاج لٹی ہوئی شام اور مقصود کربلا ہے شامل ہے۔ آپ کی شخصیت و فن پر اگر مکمل کام کیا جائے تو ایک دیوان تخلیق ہو سکتا ہے۔ اتنا فخیم و نایاب کام کا احاطہ مختصر سی سطور میں کرنا ممکن نہیں۔ آپ کی پہچان اور بخشش کا سرمایہ تو یہ قطعہ بھی بہت تھا۔

ہر یوم ہے عاشور اہلِ من دی نت صدا ہے
ہر شام ہے غریباں نیزے تے وت ردا ہے
وت دور ہے یزیدی آڈیکھ آپ مولاؑ
ظلمت دی انتہا ہے چودھار کر بلاء ہے (۴۹)

معظمہ نقوی کہتی ہیں: شہید محسن نقوی صاحب کے اس شعر کے ساتھ آپ کو خراجِ عقیدت پیش کرتی ہوں۔

عمر اتنی عطا کر میرے فن کو خالق
میرا دُشمن میرے مرنے کی خبر کو ترسے (۵۰)

اللہ ان کے لکھنے کو حسن اور بھی زیادہ نکھارے کیوں کہ ان کی شاعری کے کلمات دل کو چھو لینے کا اثر رکھتے ہیں۔

بے روز گاری اختاکتبے کتی نہیں حال غریبیں دے
عید دے ڈینہ وی بکھے راہندن اکثر بال غریبیں دے

وہ غربت میں پلے بڑھے اس لیے ان کی شاعری میں مفلسی کے رنگ نظر آتے ہیں۔

سید مبارک علی شمسی کا ادبی سفر:

"سید مبارک علی شمسی صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کا تعلق جنوبی پنجاب کے ضلع بہاولپور کے تحصیل حاصل پور کے قصبہ قائم پور سے ہے"۔(۵۱)

آپ نے ۱۶ نومبر ۱۹۸۶ء کو سید قمر عباس اسد کے گھر آنکھ کھولی۔ جنہیں پورے برصغیر میں لوگ ایک جید عالم دین اور روحانی شخصیت کے طور پر جانتے تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم وہیں مقامی اسکول سے حاصل کی اور پھر ثانوی تعلیم کے بعد علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم۔اے اُردو اور ایم۔اے جرنلزم کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے "طب اسلامی" کا ڈپلومہ بھی کیا۔

آپ بیک وقت شاعر، ادیب، محقق، نقاد، سینئر صحافی و سینئر کالم نگار اور روحانی سکالر ہیں۔ مقبول زکی مقبول سید مبارک علی شمسی نے اُن کا انٹرویو لیتے ہوئے کہا کہ آپ ایک کثیر الجہت شخصیت ہیں۔ چند ایک حوالوں پر روشنی ڈالیے، تو مبارک علی شمسی اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں کہ:

"میں نے اُردو ادب کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ جس میں میں کسی حد تک کامیاب رہا ہوں۔ یہ فیصلہ تو قارئین ہی کر سکتے ہیں، کیونکہ میں اپنے آپ کو ابھی طفل مکتب ہی سمجھتا ہوں۔ مختلف موضوعات پر میری اب تک چودہ کتب منظر عام پر آچکی ہیں"۔(۵۲)

معظمہ نقوی لکھتی ہیں کہ:

"آپ کے کلام میں اُردو سے محبت کی چاشنی کا ذائقہ بھی ملتا ہے اور سچے جذبوں کو اپنے اندازِ بیاں سے رقم کرنے کا ہنر بھی۔۔۔ اپنے خیالات، جذبات، احساسات کو مختلف انداز میں بیان کرنا کتھارسس کہلاتا ہے"۔(۵۳)

تاہم ایک شاعر بھی اپنے رنگِ بیاں میں لفظوں کا پیراہن پہنا کر ہر سننے اور پڑھنے والے کے قلوب و اذہان کو اپنی گرفت میں رکھے۔ وہی تحریر، وہی شخصیت ہی ہمیشہ زندہ و جاوید رہتی ہے۔

دوسری جگہ معظمہ نقوی لکھتی ہیں کہ:

"آج کے اس چربہ سازی کے دور میں جہاں کھرے کھوٹے کی پہچان مشکل ضرور ہوگئی ہے مگر ناممکن نہیں رہی۔ وہاں شمسی صاحب جیسے محنت کش اور کہنہ مشقِ سخن افراد کی قلت نہیں ہے۔ آپ کے کلام آپ کے سچے جذبوں کا ممکن عکاس ہے"۔(۵۴)

"چلو یونہی سہی" آپ کی غزلیان کا مجموعہ ہے۔ جس میں تمام فکری موضوعات شامل ہیں۔ ہر غزل کا ہر شعر اپنی معنویت اور فن کے اعتبار سے الگ منظر پیش کرتا ہے۔ سلاست خیالی آپ کی فنی خصلت میں شامل ہے۔ آپ کے قطعات و اشعار میں ملتی جلتی کیفیات نظر آتی ہیں۔ کہیں غمِ دوراں ہے تو کہیں غمِ جاناں۔ آپ کی شاعری میں بولتے حروف اور رقص کرتی غزلیں اس کے فن کے لیے لازوال ہونے کا پتا دیتی ہیں۔

صاحب اسلوب شاعر۔۔۔ اعظم سہیل ہارونؔ

اعظم سہیل ہارونؔ اپنے نام اور منفرد کام کی وجہ سے وطن عزیز پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہیں۔ وہ ادبی دُنیا تک ہی محدود نہیں رہے، بلکہ سماجی و عوامی حلقوں میں بھی ان کے نام کا ڈنکا بجتا ہے اور ان کا نام ہر زبان پر عام ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ لوگ ان کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا تعلق حاصل پور کے نواحی گاؤں چک نمبر ۸۷ فتح سے ہے۔ ان کا پیشہ وکالت ہے۔ ان کی تخلیقات میں ایک دریا ہے میری آنکھوں میں (شعری مجموعہ)، نور کا جلوہ (نعتیہ مجموعہ)، محبت درد کا حاصل (شعری مجموعہ)، لمحہ لمحہ قرار ہے صاحب (شعری مجموعہ)، اور مدحت آقا ﷺ کے پھول (نعتیہ مجموعہ) شامل ہیں"۔ (۵۵)

ان کا ادب سے شروع ہی سے شغف رہا ہے۔ یہ ایک کثیر الجہت اور کثیر المطالعہ شاعر اور ادیب ہیں۔ شروع سے لے کر اب تک یہ بے شمار اعزازات اور اسناد اپنے نام کر چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے محبوب سے بے وفائی کے شکوے کرتے ہوئے اپنی شاعری میں فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

کچھ پہ کچھ غور کیجئے صاحب
درد و غم اب نہ دیجئے صاحب
قرض ہم بھی اُتار لیں اپنا
کچھ اُدھار اب تو دیجئے صاحب
بند آنکھوں کے ہوں لفافوں میں خود کو ترسیل کر لیا صاحب
ہو گیا ہوں میں مختصر اعظم ان کو تفصیل کر لیا صاحب

یا پھر ان کے یہ اشعار خاطر نشین کیجئے کہ:

عشق کے راستے پہ چل کے دیکھ
کتنا مشکل ہے راستہ صاحب
غم کے دریا کو پار کرنا ہے
میرے حق میں کرو دُعا صاحب (۵۷)

اعظم سہیل ہارون صاحب اسلوب شاعر ہیں، اور ادب کی خدمت میں دن رات کوشاں ہیں۔

قربان حسین کی مجبوریاں:

قربان حسین ایک پختہ قلمکار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ آپ کا منفرد اسلوب آپ کو دیگر لکھاریوں میں ممتار کرتا ہے۔ آپ ایک جہت طبیعت کے مالک ہیں۔ آپ کی طبیعت مصنوعی پن سے نابلد ہے۔ شہرت طلبی کی بجائے آپ کی کوشش ہمیشہ لفظوں کا جادو جگانے پر مرکوز رہی۔ آپ کے کلام میں جو بات نمایاں ملتی ہے، وہ پختہ علمی، ذو فہمی، مشاہداتی فکر اور فنی بالیدگی ہے۔ جو ماہِ تابندہ ہونے کی واضح دلیل ہے۔

میری سرشت ہے میں سر اُٹھا کے چلتا ہوں
سوائے موت کے کہیں میں رک نہیں سکتا
تو مجھ کو دیکھ میرے نام کی تاریخ کو پڑھ
حُسین نام ہو جس کا وہ جھک نہیں سکتا (۵۸)

اہلِ بیعت اطہارؑ سے مودت کی بناء پر آپ نے اپنا تخلص "حسین" رکھا۔ آپ کا مؤدت کی نسبت سے ایک شعر ملاحظہ ہو:

اے اجنبی تو کون ہے تو کیسے آیا ہے
میں کربلا ہوں سوچ لے تو مارا جائے گا (۵۹)

انہوں نے خون جگر سے قرطاس کو رنگین کیا۔ اور اپنے کرب رقم کرنا اس قدر سہیل ہوتا ہے۔ تو میرؔ یوں نہ بھی فرماتے:

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب
میں نے درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

قربان صاحب بھی فقلد میرؔ ٹھہرے آپ نے اپنے کرب کو یونہی رقم کیا فرماتے ہیں۔

مجھ کو مزاجِ شہر سے کوئی گلہ نہیں
مجھ کو میرے شعور نے سولی چڑھا دیا (۶۰)

"مجبوریاں" ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے، جو کہ ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں غزل، بند، اشعار، قطعات، نغمے، منقبت و دیگر شعری اصناف پہ کام کیا گیا ہے۔ قربانؔ کے رتجگوں کا یہ ثمر ایک انمول تحفہ ہے۔

کچھ تو اپنی سادگی نے ظلم ڈھائے ہیں حسینؔ
اور کچھ ورثہ میں پائیں مہرباں مجبوریاں

آپ کی قلم سے برتے گئے موضوعات آپ کی جدت پسندی کے عکاس ہیں۔ "پہلا چہرہ" ہو یا "مجبوریاں" دونوں منفرد مقام رکھتی ہیں۔

رِقت آمیز لہجے کا شاعر:

طیار مہدی ایک ایسا شاعر جو کہ لفظوں کو سچے موتیوں کی بنی تسبیح کی مانند روانی سے پڑھتا ہے۔ اُردو و سرائیکی ادب میں ہر خاص و عام میں مقبول ہے۔ ان کی متعدد کتابیں قارئین کی نذر ہو چکی ہیں۔ آپ بنیادی طور پر نظم اور غزل کے شاعر ہیں۔ اُردو اور سرائیکی دونوں زبانوں میں آپ مشق سخن طرازی کر رہے ہیں۔

معظمہ نقوی کے بقول:

"اگر آپ کو سچے جذبوں کا شاعر مانا جائے تو قطعاً مضائقہ نہ ہو گا۔ آپ کی سحر آمیز شاعری اور بولتے لفظ، ہجر و وصال کی تمام کیفیات کے مناظر کا جو نقشہ اپنے انداز میں بناتے ہیں۔ قاری کے اندر رِقت قلب اور سرور کی خط وجدانی سی کھینچ جاتی ہے"۔(٦١)

حال ہی میں آپ کی کتاب "مر گئیں آنکھیں" منظر عام پر آئی جس میں بہتے جھرنوں کی روانی لفظ آپ کے قلمکار ہونے کی دلیل ہیں۔ جیسا کہ ایک شاعر اور ادیب کی سب سے بڑی پہچان اس کا اسلوب اور اندازِ بیان ہے۔ جو اسے دیگر لکھاریوں میں ممتاز بناتا ہے۔ طیار خان صاحب کے برتے گئے مضامین بھی اچھوتے اور نسلِ نو کے ہر دل عزیز ہیں۔ سلاست خیالی و سلاست بیانی کے آپ گرو ہیں۔ اس حوالے سے اِک نظم ملاحظہ ہو:

"خواب
میرے سر دبُت پہ
دہکتے ہوئے
تیرے ہونٹوں کی گرفت نے
ایسا کمال کر دیا۔۔۔۔۔۔
مجھے لازوال کر دیا۔۔۔۔۔۔"(٦٢)

آپ کے کلام میں ملاوت کا مزہ ہے۔ جو کہ نامور شعراء کے کلام میں ملتا ہے۔ آپ کا نام اور کام ہمیشہ رہنے والوں کی فہرست میں ہے۔

نیلا طالب اور رَیم:

"گوجرانوالہ کے نواحی گاؤں بھدے شریف سے تعلق رکھنے والی ۲۰ سالہ سیدہ انیلا طالب نے اللہ تعالیٰ کے ۹۹ ناموں پر نثری حمدیں لکھ کر عالمی اعزاز اپنے نام کر لیا ہے"۔(۶۳)

ان کا نام انٹر نیشنل بک آف اچیومنٹ اور جیکی بک آف ورلڈ ریکارڈ سمیت کئی کتابوں میں درج ہو چکا ہے۔ ۶۱ ممالک کی طرف سے انٹر نیشنل بک آف پیش ایوارڈ جیتنے والی انیلا طالب صنف بھی ہیں۔ جنہوں نے اب تک مختلف موضوعات پر سات کتابیں لکھی ہیں، جو کہ چار کتابیں جلد ہی شائع ہو جائیں گی۔ انیلا طالب نائجیریا سے گولڈن سٹار حاصل کرنے والی پہلی پاکستانی مصنف ہونے کا اعزاز بھی اپنے نام کر چکی ہیں۔

"انہوں نے انڈیپینڈنٹ اُردو کو مزید بتایا کہ اب تک ڈھائی ہزار بچیوں کو مفت قرآن پاک کی تعلیم اور ایک ہزار بچیوں کو ٹیکنالوجی کی مدد سے گھر بیٹھے بلا معاوضہ سلائی کڑھائی، دیہاتی پسماندہ لڑکیوں کو تعلیم اور ہنر ایک ساتھ فراہم کرنا ہے"۔(۶۴)

اور میرا ارادہ ہے کہ مستقبل میں پاکستان کے ۴۲ لاکھ یتیم بچوں کی معیاری تعلیم کے لیے فری سینٹر قائم کروں تاکہ دیہات کی بچیوں کا ٹیلنٹ دُنیا کے سامنے لا سکوں۔ انیلا طالب کے والدین کے مطابق انیلا نے سولہ برس کی عمر میں ہی لکھنا شروع کیا تھا اور یہ ہمارے خاندان کی پہلی مصنفہ ہیں۔ بچپن میں ان کو اسلامی تعلیمات اور شاعری سے بے حد لگاؤ تھا۔ لیکن پھر ان کی محنت اور لگن سے ۶۱ ممالک سے ان کو ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ جس پر صرف ہم نہیں بلکہ پورا گاؤں خوشی سے پھولے نہین سمارہا اور پورا گاؤں جشن منا رہا ہے۔

"آپ کی قلم نے اچھوتے مضامین تراش کر نہ صرف اپنا بلکہ پورے ملک و قوم کا سر فخر سے بلند کیا۔ شخصیت میں عاجزی اور طبیعت میں انکساری ہے۔ اور کیوں نہ ہو مقلدِ رومی رضی اللہ عنہ جو ٹھہریں۔ ان کی تعلیمات کو اپنا اوڑھنا بچھونا گردانتی ہیں"۔(۶۵)

دُنیاوی لذتوں سے ہی اپنی آنکھیں خیرہ کرنا، اور اسی نشے میں مدہوش رہنا ہی زندگی نہیں ہے۔ زندگی کا اصل مقصد اپنی وجہ تخلیق کو پہچاننا ہے۔ جب یہ نقطہ سمجھ آجائے، تب ہی اپنے رب کی شناسائی حاصل ہوتی ہے۔

آبِ زم زم:

"آبِ زم زم" ماں کی محبت کا زندہ معجزات میں سے ایک ہے۔ پوری دُنیا میں اس کی حرمت اور طہارت کے چرچے رہے ہیں۔ آب زم زم ایک نہایت ہی مبارک پانی ہے۔ جسے پی کر نہ صرف لاکھوں عاشقانِ رسول اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ بلکہ اس میں خوب برکتیں بھی حاصل کرتے ہیں"۔(٦٦)

آبِ زم زم تقریباً پانچ ہزار سال سے بھی پہلے اللہ کے نبی حضرت سیدنا اسماعیلؑ کی ایڑھیوں کی برکت سے جاری ہوا۔ آپ کی والدہ حضرت سیدنا ہاجرہ رضی اللہ عنہ نے پانی کی تلاش میں صفا مروّہ کے ۷ چکر لگائے۔ پھر جب آپ رضی اللہ عنہ سے حضرت اسماعیلؑ کی طرف آئیں تو حضرت اسماعیلؑ زمین پر اپنی ایڑھی رگڑ رہے تھے، جہاں سے رب تعالیٰ نے چشمہ جاری فرما دیا۔

"آیک روایت کے مطابق جبریل امینؑ کی ٹھوکر سے یہ چشمہ جاری ہوا۔ حضرت سیدنا ہاجرہ رضی اللہ عنہ پانی کے پاس تشریف لائیں اور پانی کے بہاؤ کو روکتے ہوئے فرمای۔ "زم زم" اسی لیے اسے آب زم زم کہا جانے لگا۔ بعد ازاں اسے کنویں میں تبدیل کر دیا گیا۔ جسے چاہِ زم زم اور برِ اسماعیل کہا جانے لگا۔ فرامین مصطفےٰ:

"آب زم زم اُسی مقصد کے لیے ہے جس کے لیے اسے پیا جائے"

"زمین پر سب سے بہترین پانی آب زم زم ہے"۔(٦٧)

یہ کنوان مسجد حرام میں خانہ کعبہ کے جنوب مشرق میں تقریباً ۲۱ میٹر کے فاصلے پر تہہ خانے میں واقع ہے۔ ایک عربی اخبار کے مطابق زم زم کے چشمے سے فی گھنٹہ ٦٨ ہزار ۴ سو لیٹر پانی مسلسل نکالا جارہا ہے۔ مسجد حرام سے ساڑھے چار کلو میٹر دور ایک کارخانہ میں یومیہ دو لاکھ گیلن آبِ زم زم ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ زم زم کا کنواں آج تک خشک نہیں ہوا۔ اس میں نمکیات کی مقدار ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ فرمانِ مصطفےٰ ﷺ:

"آبِ زم زم کو برتنوں میں ڈال لیتے اور اسے مریضوں پر چھڑکا کرتے اور انہیں پلایا کرتے تھے"۔(٦٨)

بھارت کے شہر کلکتہ سے تعلق رکھنے والے نامور صحافی، شاعر و محقق جناب مشتاق در بھنگوی نے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار نئے انداز میں کرتے ہیں۔

"اُردو ادب کی نذر آپ کا عالمی ڈائریکٹری "گوش بر آواز" کرنے کے بعد ایک خوبصورت و منفرد تالیف شاعری میں "آب زم زم" دان کر دی۔ آپ کا یہ اچھوتا کام عقیدت مندوں کے لیے کسی نایاب تحفے سے کم نہیں ہے۔ آپ کی اپنے دین سے محبت و عقیدت اور اُردو زبان و ادب سے گہری وابستگی و رچاؤ کی یہ کتاب دلیل ہے۔ یہ منفرد کام دین و دُنیا دونوں میں آپ کی نجات کا باعث ہے"۔(٦٩)

شہر مراد:

"شفیق مراد صاحب شیریں لب و لہجے کے کمتر، پُر تاثیر شخصیت و خوبصورت لفظوں کی مالا پرونے والا شاعر ہے۔ جس کی زندگی کے ہر لمحہ کا نام ادب کی مراد ہو۔ انھوں نے اپنی آدھی زندگی یورپ گزاری اور آپ کا مقصد ہمیشہ ترویج اُردو ادب ہی رہا ہے۔ "شریف اکیڈمی جرمنی" کے اجراء کا مقصد ابھی اسی نقطہ نظر کے تحت کیا گیا"۔(۷۰)

آج تقریباً پوری دُنیا میں جہاں جہاں شائقین اُردو ادب موجود ہیں۔ اکیڈمی کے ممبران بھی وہاں وہاں اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں"۔

"شفیق مراد صاحب نے اپنے دل کے شہر کا ایک لازوال نمونہ اپنی کتاب "شہر مراد" میں ہمیں دکھایا۔ آپ کی غزل ہو یا نظم آپ کی انفرادیت پتا دیتی ہے۔ آج کل کے دور کی غزل میں عموماً قافیہ پیمائی ہی ملتی ہے۔ جبکہ آپ کے کلام میں نہ صرف کلاسیکیت وجت کا حسین امتزاج ہے، بلکہ آپ نے نئے نئے موضوعات اور مضامین کو بھی اپنے اشعار میں جگہ دی"۔(۷۱)

شہر مراد میں گھومنے اور اس کی دیدہ زیب گلیوں سے گزرنے کا جب شرف ملا۔ تو بے اختیار میرا قلم اس کی توصیف میں اُٹھ گیا۔ اپنی محسوسات کو مصنف کے رنگِ بیاں سے بیان کرنے کی سعی کرتی ہوں۔

؎ میں اپنی ذات میں اِک کائنات رکھتا ہوں — میں بے ثبات ہوں لیکن ثبات رکھتا ہوں

؎ بس گیا ہوں ان کے دل میں اور بانہوں کا حصار — وصل کی شب ہے خدایات! یا کہ سوچوں کا سراب

؎ آج پہلو سے مرے وہ لگ کے بیٹھا جب — مرآد یوں لگا جیسے کہ مہتاب قرینِ آفتاب

؎ فکر معاش عشق بتاں سے گزر گیا — دل سے گزرنا تھا مجھے جاں سے گزر گیا

؎ واعظ نہ درس دے مجھے اب ضبط عشق کا — نالہ وہی جو آہ و قصاں سے گزر گیا

؎ عجب مشکل میں اب یہ داستاں ہے — زمیں نیچے نہ اُوپر آسماں ہے

؎ انسان تھا میں درد کی شدت سے کٹ گیا — سمٹا ہوا وجود تھا ٹکڑوں میں بٹ گیا

؎ آنکھ پُر نم ہے اور لب خاموش — بات کوئی تو یاد رہتی ہے

؎ آدمی کو جب شعور آگہی آجائے گا — ظلمتیں مٹ جائیں گی اک نور سا چھا جائے گا

؎ کوئی منزل عطا ہو میرے ان الفاظ کو مولا — یہ ایسے آبگینے ہیں جو بحروبر میں رہتے ہیں

مصنف کی یہ شاہکار تخلیقات مجموعہِ غزل ایک سو چوالیس صفحات پر مشتمل ہے۔(۷۲)

اس کا انتساب آپ نے اپنی رفیقہ حیات کے نام منسوب کیا، جو آپ سے زندگی کے خوبصورت سفر میں بہت جلد جدا ہو گئیں۔ شفیق مراد صاحب کا قلمی نسخہ آپ کے شائقین کے لیے انمول تحفہ ہے۔ ادبی دُنیا میں آپ کے نام و کام کو ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا اور یاد رکھا جائے گا۔

معظمہ نقوی نے کہا کہ:

"آپ کے ایک خوبصورت شعر کو انتخاب کر کے آپ کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہوں گی"۔

نہ جانے کس نے لکھا میرا قصہ
نہ جانے کون میرا ترجماں ہے (۷۳)

مرشدِ ماھم پر اک طائرانہ نظر:

مرشدِ ماھم بھلوال سے تعلق رکھنے والے عظیم اور درویش شاعر محمد یعقوب فردوسی امیر بادشاہ کی کتاب کا نام ہے۔ فردوسی صاحب کی یہ کتاب ایک سو چھیہتر (۱۷۶) صفحات پر مشتمل ہے، اور اسے ایم ار سلان پبلیکیشنز ملتان نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔

"فردوسی صاحب کو پوری دُنیا میں نعتیہ ماہیا نگاری کی فخیم کتب لکھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ جن میں ورفعنالک ذکرک" اور "کن فیکون" کے نام قابل ذکر ہیں۔ جن کی ضخامت دو ہزار صفحات سے بھی زیادہ ہے" (۷۴)

یعقوب فردوسی صاحب طویل عرصے سے علم و ادب کی آبپاری کرنے میں مصروف ہیں۔ مرکز سے دور رہ کر بھی اپنا اور اپنی دھرتی ماں کا نام روشن کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے ہر کونے میں منعقد ہونے والی تقریبات میں بھی شرکت کرتے ہیں۔ ان کو ملنے والے ایوارڈز کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جن میں "بھیل ایوارڈ"، "کارِ خیر انٹرنیشنل ایوارڈ" اور "الوکیل کتاب ایوارڈ ۲۰۲۲ء" سرفہرست ہیں۔

مرشد ماھم ان کی تازہ ترین تخلیق ہے۔ جسے انہوں نے اپنے مرشد اور روحانی پیشوا معروف شاعر، ادیب، محقق، شینئر صحافی و سینیئر کالم نگار اور روحانی مکالہ مخدوم سید مبارک علی شمسی کی محبت میں مرتب کر کے ان کی عقیدت کی اک نئی تاریخ رقم کر دی۔

"مرشد ماھم" میں فردوسی صاحب "مکدی گل" کے عنوان سے اپنے مضمون میں یوں رقمطراز ہیں کہ:

سمجھ نئیں آندی اج اپنی گل کیویں مکاواں — کیوں جے ایہہ میری چوتھی کتاب اے
جیہڑی عشق دے ویڑے دھالاں پاندی — پھر دی اے۔ میں تے اج تائیں کسے
دی شاں اچ اک اکھر وی نئیں لکھیا سی — تے فیر کی ہویا حضرتِ عشق نہیں گھنگھرو
بنا دِتے تے میں نچدا پیرو مرشد ولی — کال آل نبی ﷺ اولادِ علیؑ حضرت شاہ

شمس تبریز ملتانی دے بوہے جا وڑھیا تے　　اوتھے مینوں اک گھرو ملیا، جیدا ناں سی
سید مبارک علی شمسی تے فیر کی ہویا کہ　　اوناں دی شان تے اک کتاب بن گئی (۷۵)
(مرشدماھم)

یعقوب فردوسی کی مذکورہ کتاب پڑھ کر اندزہ ہوتا ہے کہ انہیں تصوف سے کس قدر لگاؤ ہے۔ وہ مرشد ماھم سید مبارک علی شمسی کو مرشد مانتے ہیں۔ اسی لیے تو وہ برملا کہہ اُٹھتے ہیں کہ:

بھاگاں　　والی　　جمیاں　　ہے
مبارک　　شمسی　　نوں
اساں مرشد　　منیا　　ہے

مرشدِماھم سے عقیدت کا اظہار ان کی اس کتاب میں جابجا موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ایہہ　　پیار　　کہانی　　ہے
مبارک　　شاہ　　شمسی
ساڈا　　دلبر　　جانی　　ہے (۷۶)

محمد یعقوب فردوسی حضرت شاہ شمس الدین سبزواری تبریزی کے کسب فیض کے طلبگار ہیں۔ وہ ایک عقیدت مند اور سادات عظام کے حب دار انسان ہیں۔ جس کا اظہار وہ کھلے بندوں میں کرتے ہیں۔

ملتان　　چوں　　آئی　　ہے
مبارک　　شمسی　　نیں
مینوں　　مالا　　پائی　　ہے (۷۵)

یعقوب فردوسی نے سید مبارک علی شمسی کے فن اور شخصیت پہ مرشدِماھم کی صورت میں ضخیم کتاب مرتب کر کے ان سب اپنی بے پایاں محبت وعقیدت کا حق ادا کر رہے ہیں۔

فصلِ آرزو:

لندن میں مقیم پاکستانی شاعرہ محترمہ فرزانہ فرحت صاحبہ کے تاحال چار شعری مجموعے زیور طبع سے آراستہ وہ پیراستہ ہو چکے ہیں۔ بدلتی شام کے سائے، خواب زندگی، آنسو اور فصل آرزو۔ ان کی شاعری اتنی سادہ و سلیس ہے کہ از دل خیزو ہر دل ریز دوالا معاملہ ہے۔ چونکہ ان کی شاعری خوابوں کی تمثیل و تمثال ہے۔ اس لیے میں نے انہیں خوابوں کی شاعرہ کہا ہے۔
مرزا غالب کا مشہور مصرع ہے۔

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں (۷۸)

وہ نزول شاعری کا سبب اپنے شہید بھائی ڈاکٹر شمس الحق کی اندوہناک شہادت کو قرار دیتی ہیں۔ دہشت گردی کے اس فاجع جانکاہ نے ان کی روح تک کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ ان کی نظم میرے شہید ایک بہن کی بھائی سے بے لوث محبت اور اس کی جدائی میں دلدوز نوحہ ہے۔ قرآن مجید ک آیت مبا کہ:

ترجمہ: "جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ مت کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں"۔

کاس مبرو! رضا بھرتے ہوئے کہتی ہیں:

جسے شہید کا رتبہ نصیب ہوتا ہے
مجھے یقین ہے خدا کا حبیب ہوتا ہے (۷۹)

فرزانہ فرحت کی شاعری میں خواب اک استعارہ ہے۔ یہ وہ خواب نہیں جو بند آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے بلکہ یہ وہ خواب ہے جو کھلی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے۔ کہتی ہیں۔

میں نے تو کھلی آنکھ سے دیکھے ہیں کئی خواب
کیوں نیند میں سپنا کوئی سندر نہیں دیکھا (۸۰)

آپ کے جذبے کھرے اور آئینے کی مانند شفاف ہیں۔ عشق مجازی میں وہ دُنیا کی طلب نہیں ملتی جو آج کل کے معاشرے کا المیہ بن گئی ہے۔ جنون وحوس پرستی کو عشق کا نام دیا جاتا ہے۔ بلکہ وہ کہتی ہیں کہ:

عجیب دل کا رہا تھا معاملہ فرحتؔ
میں دل کے شور شرابوں میں گم رہی برسوں (۸۱)

فرزانہ فرحت کے لب و لہجے میں نہ تو محبوب کی روایتی بے وفائی کا رونا ملتا ہے۔ نہ وہ اس دُنیائے فانی سے مایوس ملتی ہیں۔ بلکہ وہ اپنے عشق کی مدھم الاؤ میں سلگتی دکھائی دیتی ہیں۔ فرزانہ فرحت کا اسلوب سخن ان کے کلام کے خصائص ہیں۔ اُردو شاعر میں میر تقی میر، مرزا غالب، سودا، ذوق، میر انیس، مرزا دبیر، اقبال، جوش، فیض اور فراز کی شاعری پر فارسیت کا غلبہ نمایاں ہے۔

فرزانہ فرحت کہتی ہیں:

کوئی رنجش کوئی گلہ سا ہے
تو جو مجھ سے خفا خفا سا ہے (۸۲)

فرزانہ فرحت کی شاعری پر تحقیق ہونی چاہیے۔ یہ شاعری دو آتشہ ہے۔ غم ذات بھی اور فکرِ کائنات بھی، ان کی ساری شاعری میں رجائیت کا پیغام حرزِ جاں ہے۔

لفظ لفظ حقیقت:

رابعہ شاہین کا تعلق بابا گرونانک دیو جی کی نگری ننکانہ صاحب سے ہے۔ ادب کی یہ تازہ کلی اپنے مشاہدات اور معاشرتی حقائق کو قرطاس و قلم کی زینت بنانے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں۔ اُردو زبان میں پختگی ان کی تحاریر میں واضح نظر آتی ہے۔

"اپنے انداز بیاں سے قاری کے قلوب و اذہان پر سحر طاری کرنے کا ہنر بھی رکھتی ہیں۔ آپ کی پہلی کتاب لفظ لفظ حقیقت جو کہ مختصر بارہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ جو آپ نے اپنے ارد گرد رونما ہونے والے حالات و واقعات کے پیشِ نظر لکھیں"۔(۸۳)

ایک لکھاری اپنے معاشرے میں ہونے والے ظلم وجود کو مشاہداتی تجزیے کی بناء پر اپنے قلم کے ذریعے ہی دیگر لوگوں تک معاشرے کی ممکنہ اصلاح و فلاح کا عمل جاری رہ سکے اور مزید انتشار پھیلنے سے روکا جاسکے۔ رابعہ کے ساتھ بھی ہمارے معاشرے کی ہر بیٹی والا المیہ ہے۔ کہ والدین کی طرف سے عدم اطمینان کا اظہار جو انہوں نے اپنے ابتدائیہ میں بیان کیا ہے، مگر اپنی مخفی صلاحیتوں کو مثبت انداز میں بروئے کار لانے کا ان کا یہ عزم لائقِ صد تحسین ہے۔ آپ کی مزید کامیابیوں کے لیے نیک تمنائیں۔

اک فوجی کی قلم سے:

بریگیڈیئر صولت رضا(ر) فوجی افسر نے اپنے قلم سے قارئین کو اکتوبر ۱۹۷۵ء میں "کاکولیات" کے نام سے ایک تحفہ نذر کیا۔ یہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول زیر تربیت کیڈٹ کی پہلی آپ بیتی ہے۔ ۲۰۲۱ء میں اس کا اکتیسواں ایڈیشن شائع ہوا اور میری خوش بختی ہے کہ مجھے بھی اس کتاب سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ یوں سمجھیں کہ ایک فوجی کا نہایت کٹھن مرحلہ ہوتا ہے کہ وہ نفیس پتھر کو سخت بنانے کا عمل ہوتا ہے۔

"میں نے سنا تھا کہ آرمی والوں کے بنیادی اُصول میں دو باتیں سکھائی جاتی ہیں۔ Do and Die کبھی زندگی میں کسی خاکی خوبصورت سے زیادہ دل و دماغ پہ خوف طاری کر دینے والی وردی والے سے گفتگو کرنے کا موقع میسر ہی نہیں آیا۔ یہ اتفاق بھی مجھے "کاکولیات" کا مطالعہ کرنے کے بعد ہوا۔ میری تو گویا کایا پلٹ گئی"۔(۸۴)

کتاب میں جنٹلمین کیڈٹس کا فرنٹ رول بہت دلچسپ اور روہانسا کر دینے والا تھا۔ پڑھنے سے یقین ہوتا ہے کہ اس فرنٹ رول کا سینیئر بن کر بدلہ چکالیا جائے گا۔

"مصنف لکھتے ہیں جبراً اپنا چہرہ دیکھا، چہرے کی نسبت سوٹ کا غم زیادہ تھا۔ اور جگہ جگہ لکھتے ہیں۔ ہر چہرے پر کیچڑ کا سماں تھا، بعض جگہ دلدل کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ سر دیکھتے تو ان کی ویسی حالت ہوتی جو مور کی اپنے پاؤں کا نظارہ کر کے ہوتی ہے"۔(۸۵)

ایسی دلچسپ لائنیں جابجا کتاب میں بکھری ہیں۔ قاری جن کو چن کر حافظے میں محفوظ کر سکتا ہے اور دیر تک ان سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ کاکولیات ایک کیڈٹ کی جرات، ہمت اور استقامت کی کہانی ہے۔ پاک فوج میں جانے کا خواب دیکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک بہترین تحفہ ہے۔ جو کمزور دلوں کو ڈراتی بھی ہے۔ اور عزم پختہ رکھنے والوں کی رہنمائی بھی کرتی ہے۔ اس میں پی۔ ایم۔ اے کاکول کی سختیاں انتہائی شگفتہ انداز میں بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب ہر گھر میں ہونی چاہیے۔ ہر پاکستانی کو پڑھنی چاہیے، کہ ہمیں ہمارے بچوں کو پتا چلے کے سرحدوں پہ کھڑے ہمارے محافظ کتنی سختیاں جھیل کر ہمیں آسانیاں دینے کے لیے چاک و چوبند کھڑے ہیں۔ خود جاگتے ہیں، لیکن ہمیں سکون کی نیند دیتے ہیں۔ آرام دہ ماحول سے اُٹھ کر سرد راتوں کی ٹھنڈک اور گرم دنوں کی تمازت جھیلنا آسان نہیں۔ فوجی آفیسرز کے شانوں سے چمکتے ستارے یقیناً آسمان کی بلندیوں سے اُترتے ہیں

"کاکولیات پڑھ کر اپنے فوجی جوانوں پر فخر ہوا۔ کہ کس طرح وہ اتنی مشکلات برداشت کر کے خود کو وطن کی حفاظت کے لیے تیار کرتے ہیں۔ اگر وہ چاہیں تو خود کو مشکل سے آزاد کر کے ہمارے جیسی آسان زندگی جی سکتے ہیں۔ لیکن ان کے دلوں میں موجود وطن کی محبت کے جذبات ان کا ہر راستہ آسان کرتے ہیں۔ ہم سرحدوں پہ مامور انھی جوانوں کی وجہ سے ہی محفوظ ہیں۔ اور وطن انھی جوانوں کی محبت برداشت کر کے خود کو وطن کی حفاظت کے لیے تیار کرتے ہیں"۔(۸۶)

اگر وہ چاہیں تو خود کو مشکل سے آزاد کر کے ہمارے جیسی آسان زندگی جی سکتے ہیں، لیکن ان کے دلوں میں موجود وطن کی محبت کے جذبات ان کا ہر راستہ آسان کرتے ہیں۔ ہم سرحدوں پہ مامور انھی جوانوں کی وجہ سے ہی محفوظ ہیں۔ اور یہ وطن انھی جوانوں کی محبت اور ہمت و بہادری کی وجہ سے سلامت ہے۔

"ادب سے والہانہ عقیدت آپ کی نثری تخلیقات سے نمایاں ہے، جو آپ کی طبیعت کی فطری نفاست و قلم سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے"۔ آپ کی "کاکولیات" کے علاوہ تخلیقات میں "غیر فوجی کالم" ہے جو آپ نے ریٹائرمنٹ کے بعد مختلف اخبارات میں کالم لکھے۔ ان میں سے چند کالم کو آپ نے کتابی مجموعہ کی شکل دی"۔(۸۷)

ان کی دو کتب زیر طباعت ہیں۔ کاکولیات کی ترتیب آپ نے آٹھ موضوعات پر رکھی ہے۔ جس کا پہلا باب آپ نے صراط کمیشن کے نام سے کیا۔ اس کا انتساب ٹیپو کے نام ہے۔ یہ خوبصورت تصنیف ہے۔

ادب نواز شخصیت:

"پروفیسر جاوید گل گشکوری کا شمار اپنے وسیب کے پختہ قلمکاروں میں ہوتا ہے۔ ادبی حلقے آپ کی موجودگی کے بناء ادھورے تصور کیے جاتے ہیں۔ آپ کا تعلق ڈی۔جی۔خان شہر سے ہے۔ پیشہ کے لحاظ سے آپ پیغمبرانہ منصب سے منسلک ہیں۔ آپ متوان شخصیت، شاعرانہ روح کے ساتھ نرم مزاج و نفیس طبیعت کے مالک ہیں"۔(۸۸)

آپ کی کتاب شعری تصنیف میں "خواب ادھورے رہ گئے"۔ زیر طباعت ہے۔ آپ نے شعری میدان میں جن اصناف پہ طبع آزمائی کی۔ ان میں حمد، نعت، غزل، نظم، ہائیکو، قطعہ، رباعی وغیرہ شامل ہیں۔ آپ کے روحانی اساتذہ میں میرؔ و ناصر کاظمیؔ کا نام سر فہرست ہیں۔ آپ ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ شاعری میں آپ کے دو تخلص ملتے ہیں۔ جاویدؔ اور گلؔ۔ معظمہ نقوی کہتی ہیں:

کچھ منتخب اشعار پیش کرنا چاہوں گی:

گزرا ہوں کیسے ضبط کے موسم سے کیا کہوں
پاکر بھی تجھ کو جانِ جاں کھونا پڑا بہت
کبھی تجھے جس کی چاندنی پہ تھا ناز جاویدؔ
لو دھوپ بن کر فضا میں لہرا وہ چاند چہرہ (۸۹)

آپ کے کلام میں محبوب کے وصل کی چھاؤن مین بھی ہجر کے لگے زخموں اور سلگاتی دھوپ کی تپش کا گہرا رنگ دِکھتا ہے۔ آپ نے نثری میدان میں بھی اپنی فنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ تحقیق و تنقیدی نصاب کی کتب آپ نے تخلیق کر کے ادب کی خدمت کی ہے وہ لائق صد ستائش ہے۔

ان کی تخلیقات میں نامور شعراء اُردو، آفاقِ ادب، دیہی عمرانیان، شہری عمرانیات اور میر مجلس شامل ہیں۔ آپ کے فن و شخصیت پہ تحقیقی کام غازی یونیورسٹی ڈی۔جی۔خان اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں ہو چکا ہے۔ آپ کا کامیاب ادبی سفر اپنے بھرپور انداز میں رواں دواں ہے۔ آپ اپنی قلم سے ادب کی آبیاری کے لیے کوشاں ہیں۔

زاہد اقبال بھیل کی ادبی خدمات:

زاہد اقبال بھیل کو بھیل انٹرنیشنل لائبریری کے بانی کو سارا زمانہ جانتا ہے، اور آپ کا نام ملکی اور غیر ملکی سطح پر جانا مانا جاتا ہے۔

"زاہد اقبال بھیل صاحب کا تعلق ننکانہ صاحب سے ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۱۵ جولائی ۱۹۷۸ء بروز ہفتہ کو محمد علی بھیل کے گھر گاؤں چاہ بھیلاں میں آنکھ کھولی (ننکانہ صاحب)۔ ان کی پیدائش کے دو ماہ گزر جانے کے بعد ان کے ابو محمد علی بھیل نے ۷ کلو میٹر کے فاصلے پر ابھیانوالہ نام سے ایک نیا گاؤں آباد کیا"۔(۹۰)

ان کے والد ماجد محمد علی بھیل نے زرعی زمین خرید کر کاشت کاری شروع کر دی۔ ان کا ڈیرہ بھیلاں کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ قرآن پاک کی تعلیم اپنے بزرگوں اور ان کے دوستوں سے حاصل کی۔ دُنیاوی تعلیم بی۔ اے ماس کے بعد پی۔ ٹی سے ۲۰۰۱ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ٹائپنگ کورس ۱۹۹۷ء میں کیا۔ اعجاز ٹائپنگ کالج ننکانہ صاحب سے پاس کیا۔ کمپیوٹر کالج سافٹ ویئر کی ڈگری ۱۹۹۷ء میں فاریہ کمپیوٹر کالج ننکانہ صاحب سے کی۔

"نثر اور شاعر میں جن قلم کاروں سے اصلاح لیتے ہیں۔ ان کے نام درج ذیل ہیں۔ پروفیسر سید بشیر حسین شاہ زاہد ننکانوی، ڈاکٹر محمد مشرف حسین انجم سرگودھا، حاجی فقیر اثر انصاری فیض پور خورد نزد لاہور اور عبدالرشید شاہد ننکانوی شامل ہے"۔(۹۱)

سالانہ بھیل انٹرنیشنل ایوارڈز تقریب آپ کی بے شمار ادبی کاوشوں کی ایک کڑی ہے جو گزشتہ چھ برس سے جاری ہے۔ پاکستان بھر کے شعراء و ادباء کی کثیر تعداد شرکت کرتی ہے۔ بلکہ بیرون ملک سے بھی کثیر تعداد میں لکھاریوں کی کثیر تعداد شمولیت اختیار کر کے اس تقریب کو مزید چار چاند لگاتی ہے۔

بلاشبہ اس تقریب کے ذریعے شروع سے لیکر تاحال بے شمار دانشوروں اور ادیبوں میں تعریفی اسناد، ایوارڈز اور سلور و گولڈ میڈلز تقسیم کیے جا چکے ہیں۔ آپ ایک ادبی مجلہ" قلم و قرطاس" کے مدیر اعلیٰ اور سالانہ کتابی سلسلہ "ادبی ستارے" کی اشاعت کا اعزاز بھی رکھتے ہیں۔

بھیل ادبی انٹرنیشنل لائبریری کے نام سے آپ نے اپنی رہائش گاہ پر ایک عالیشان لائبریری بنا رکھی ہے۔ جس میں مختلف موضوعات پر ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ جن سے علم و ادب سے شغف رکھنے والے بہت سارے افراد بھی پورا استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔ آپ کا تحقیقی کام زور و شور سے جاری و ساری ہے۔ زاہد اقبال بھیل ایک باہمت اور باصلاحیت انسان ہیں۔ اور پانی بہترین حکمت و عملی کے باعث علم و ادب کے فروغ کے لیے ہر وقت کوشاں ہیں۔

وہ ہمیشہ علمی و ادبی امور سرانجام دے کر اپنے ذوق و شوق کو پورا کرتے رہتے ہیں۔ آپ کی ادب سے سچی لگن آپ کو کہیں بیٹھنے نہیں دیتی۔ یہ کرب ایوارڈ، ادبی محافل، محفل مشاعرے وغیرہ سب اسی لگن کے مرہونِ منت ہیں۔ بلاشبہ آپ پر شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے۔ کہ:

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانا (۹۲)

زاہد اقبال بھیل کی ادبی کاوشیں لائق صد تحسین ہیں۔

حوالہ جات

۱. ڈاکٹر محمد خان، اصنافِ نظم و نثر، ناشران و تاجران کتب، ص:۱۷۸

۲. m.facebook.com

۳. ایضاً

۴. ایضاً

۵. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳ء، ص:۸۸

۶. mazameen.com

۷. ایضاً

۸. ایضاً

۹. ایضاً

۱۰. ایضاً

۱۱. ایضاً

۱۲. ایضاً

۱۳. ایضاً

۱۴. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۸۹

۱۵. ایضاً

۱۶. ایضاً

۱۷. urdupoint.com

۱۸. ایضاً

۱۹. ایضاً

۲۰. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۹۱

۲۱. urdupoint.com

۲۲. ایضاً

۲۳. ایضاً

۲۴. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۹۲

۲۵. ایضاً

۲۶. https://ur.m.wikipedia.org/wiki/%DB%81%D8%A7%D8%A6%DB%8C%DA%A9%D9%88

۲۷. ایضاً

۲۸. ایضاً

۲۹. ایضاً

۳۰. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۹۳

۳۱. ایضاً

۳۲. ایضاً

۳۳. ایضاً

۳۴. ایضاً

۳۵. grups.google.com

۳۶. ایضاً

۳۷. ایضاً

۳۸. ایضاً

۳۹. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۹۷

۴۰. ایضاً

۴۱. ایضاً، ص:۹۸

۴۲. ایضاً

۴۳. ایضاً، ص:۹۹

۴۴. https://ur.m.wikipedia.org/wiki/%D8%B1%D8%AD%D9%85%D8%AA-%D8%B9%D8%B2%DB%8C%D8%B1%D8%A7%D9%84%DB%8C

۴۵. ایضاً

۴۶. ایضاً

۴۷. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۱۰۰

۴۸. ایضاً، ص:۱۰۱

۴۹. ایضاً، ص:۱۰۲

۵۰. ایضاً

۵۱. https://www.iattack.com/conversation-with-syed-mubarak-ai-shamsi

۵۲. ایضاً

۵۳. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۱۰۳

۵۴. ایضاً

۵۵. ایضاً، ص:۱۰۵

۵۶. ایضاً، ص:۱۰۶

۵۷. ایضاً

۵۸. ایضاً، ص:۱۰۷

۵۹. ایضاً

۶۰. ایضاً، ص:۱۰۸

۶۱. ایضاً، ص:۱۰۹

۶۲. ایضاً

۶۳. https://www.independenturdu.com/node/119316

۶۴. ایضاً

۶۵. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۱۱۱

۶۶. https://www.dawateislami.net/magzine/ur/tareekh-kay-auraq/abc.zam-zam

۶۷. https://dailypakistan.com.pk/16-Dec-2016/493939

۶۸. ایضاً

۶۹. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۱۱۳

۷۰. ایضاً

۷۱. ایضاً

۷۲. ایضاً

۷۳. ایضاً، ص:۱۶۶

۷۴. ایضاً، ص:۱۱۷

۷۵. ایضاً

۷۶. ایضاً، ص:۱۱۸

۷۷. ایضاً، ص:۱۱۹

۷۸. https://weeklynewspakistan.com?P=39460

۷۹. ایضاً

۸۰. ایضاً

۸۱. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۱۲۱

۸۲. https://weeklynewspakistan.com?p=39460

۸۳. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۱۲۳

۸۴. ایضاً، ص:۱۲۴

۸۵. https://www.humsub.com.pk/437980/zaiba-shahzad-122

۸۶. ایضاً

۸۷. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳، ص:۱۲۴

۸۸. ایضاً، ص:۱۲۵

۸۹. ایضاً

۹۰. https://www.iattock.com/interview/-with-zahid-iqbal-bhil

۹۱. ایضاً

۹۲. معظمہ نقوی، "نوائے نقوی"، زوہیب پبلیشرز، حاصل پور، جنوری ۲۰۲۳ء، ص:۱۲۸